معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسّی روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے فی شمارہ سات روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

**DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH**

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔
- اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۶۵ ماہ محرم الحرام ۱۴۲۱ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۰۰ء عدد ۴

فہرست مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۲۳۱-۲۴۴

مقالات

عمید الدین ابو نصر ابزری فارسی انصاری مصنف قصیدۂ اشکنوانیہ معاصر سعدی شیرازی — پروفیسر نذیر احمد صاحب — ۲۴۵-۲۷۱

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مطالعہ و خدمت زبان کی سرگزشت — ضیاء الدین اصلاحی — ۲۷۲-۲۹۷

الفاظ سے مشتق اقبال کی چند بصیرت افروز اصطلاحیں — جناب محمد بدیع الزماں صاحب — ۲۹۸-۳۱۰

معارف کی ڈاک

(۱) مولانا سید محمد رابع الحسنی الندوی صاحب — ۳۱۱-۳۱۲

(۲) جناب محبوب الرحمن فاروقی صاحب — ۳۱۳

(۳) جناب محمود حسن حسنی ندوی — ۳۱۳-۳۱۴

مطبوعات جدیدہ — ع۔ص۔ — ۳۱۵-۳۲۰

شذرات

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی غیر معمولی عظمت و مقبولیت اس سے بھی آشکارا ہے کہ ان کی وفات کے بعد بہ کثرت تعزیتی جلسے ہوئے ان پر برابر مضامین لکھے جارہے ہیں، رسالے و اخبار اپنے خاص نمبر نکال رہے ہیں اور ان پر سیمناروں کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ سب سے پہلے ہمارے پاس جنوری کے اواخر میں ممبئی کی انجمن اسلام کے ۲۸ مارچ کو ہونے والے سیمنار کا دعوت نامہ آیا۔ ممبئی میں دارالمصنفین کے قدردانوں کا وسیع حلقہ ہے ان سے ملاقات، انجمن اور دارالمصنفین کے قدیم روابط اور خود حضرت مولانا کی شخصیت کی کشش کی بنا پر ہم نے اس میں شرکت منظور کرلی، چند روز بعد ہمارے خاص کرم فرما پروفیسر مختار الدین احمد کے گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حضرت مولانا پر سیمنار ہونے والا ہے اس کا باضابطہ دعوت نامہ آیا اور شعبہ کے چیرمین اور سیمنار کے کنوینر ڈاکٹر صلاح الدین عمری نے فون پر شرکت کے لئے اصرار کیا۔ اسی درمیان مولانا سلمان حسینی کا دعوت نامہ آیا کہ جامعہ سید احمد شہید کٹولی ملیح آباد میں سہ روزہ سیمنار ہورہا ہے اس کی تاریخیں وہی تھیں جو انجمن اسلام ممبئی کی تھیں اس لئے خواہش کے باوجود شرکت کی سعادت سے محرومی رہی۔ سب کے آخر میں مولانا ریاض الدین فاروقی ناظم کاشف العلوم کا دعوت نامہ آیا۔ بعض اور سیمناروں کی بھی اطلاع ہوئی۔

جگہ کی تنگی کی وجہ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے سیمنار کا ذکر گذشتہ شمارے میں نہیں کیا جاسکا تھا، یہ ۲۲، ۲۳ فروری کو ہوا، افتتاحی جلسے کی صدارت ڈاکٹر محمود الرحمن وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کی، انھوں نے اپنی پرمغز صدارتی تقریر میں مولانا کے نام سے یونیورسٹی میں چیر قائم کرنے کا اعلان کیا، سیمنار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر کفیل احمد قاسمی کے خیر مقدمی کلمات سے سیمنار کا آغاز ہوا، ڈاکٹر صلاح الدین عمری نے موضوع کی اہمیت اور سیمنار کا مقصد بتایا، مولانا سعید الرحمن اعظمی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے کلیدی تقریر کی، پروفیسر محمد راشد ندوی اور پروفیسر محمد سالم قدوائی نے مولانا کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کئے، شعبہ کے استاذ ڈاکٹر

ابوسفیان اصلاحی نے خوبصورت انداز میں شرکاء کا شکریہ ادا کیا، مقالات کے جلسوں کی مختلف حضرات نے صدارت کی، میں نے جو مضمون پڑھا تھا وہ بعض حضرات کے اصرار کی وجہ سے اس شمارے میں شایع ہورہا ہے۔ مقالات کے جلسے ۹۔۱۰ بجے صبح سے ۸ ½ بجے شب تک ہوتے تھے شرکاء کی تعداد معتد بہ تھی، لوگ بڑی توجہ اور دلچسپی سے مقالات سنتے اور بحث و گفتگو میں حصہ لیتے۔ مولانا کی برکت، ڈاکٹر صلاح الدین عمری کے اخلاص اور شعبہ کے اساتذہ و طلبہ کی دلچسپی سے یہ سیمنار کامیاب رہا، شعبہ کے ریسرچ اسکالر رشید احمد ندوی اور توقیر احمد ندوی مہمانوں کی خدمت اور پذیرائی میں پیش پیش رہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو انجمن اسلام ممبئی سے خاص لگاؤ تھا، اس کے اسٹیج سے وہ متعدد بار قوم کو خطاب فرماچکے ہیں، اس لئے انجمن کے ارکان نے مولانا کے فکر و پیغام کو عام کرنے کے لئے ۲۸ مارچ کو یک روزہ علمی سیمنار کے انعقاد کا فیصلہ کیا جو انجمن کے صدر ڈاکٹر محمد اسحق جم خانہ والا کی صدارت میں الماطیفی ہال صابو صدیق کمپلکس میں ہوا جس کی نظامت انجمن کے اعزازی ڈائرکٹر آدم شیخ نے کی۔ مولانا سید محمد رابع ندوی کا پرمغز مقالہ مولوی محمد الیاس بھٹکلی نے پڑھا، مولانا ابوظفر حسان ندوی نے اپنا جامع مقالہ بڑے دلچسپ انداز میں پڑھا، جناب شمیم طارق کا مقالہ بھی اچھا تھا، حسن اتفاق سے مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کی شرکت اور دلچسپ تقریر سے سیمنار کی رونق بڑھ گئی۔ دوسرے اجلاس میں راقم اور مولوی عبدالرزاق ندوی کے مقالے ہوئے وقت کی کمی کی بنا پر مولانا محمد سالم قاسمی اپنا مقالہ نہیں پڑھ سکے، مگر ان کی جاندار تقریر سے حاضرین محظوظ ہوئے۔ مولانا مستقیم احسن اعظمی کی مختصر تقریر اور ڈاکٹر آدم شیخ کے شکریے کے بعد یہ باوقار اور کامیاب سیمنار اختتام پذیر ہوا، اس میں پڑھے گئے مقالے انشاء اللہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سہ ماہی ادبی و علمی مجلہ "نوائے ادب" کے خاص نمبر میں شایع ہوں گے۔

ان ہی دنوں بھیونڈی کی پیوپلس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام چلنے والے صلاح الدین ایوبی میموریل

اسکولس اینڈ کالج کی سلور جبلی تقریبات منائی جارہی تھیں اس سلسلے میں ۲۵ مارچ کو ایک کل ہند مشاعرہ اور ۲۶ مارچ کو "نوجوانانِ ملت اور دورِ حاضر کے تقاضے" کے عنوان سے ایک تعلیمی سمینار بھی ہوا، سوسائٹی کے فعال سکریٹری جناب جلیس اعظمی نے مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا اور کئی بار فون کیا، یہ دونوں پروگرام بھی کامیاب رہے، سمینار میں پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری وائس چانسلر مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، ڈاکٹر اسحاق جم خانہ والا، ڈاکٹر آدم شیخ ڈاکٹر زید۔ کے۔ فیضان، مولانا ابوظفر حسان ندوی اور خاکسار کے علاوہ بعض صحافی حضرات کی تقریریں ہوئیں، مولانا مستقیم احسن اعظمی نے بڑی خوش اسلوبی سے نظامت کی، بھیونڈی کے قیام میں مولانا اعظمی کے عزیز دوست برادرم ہارون صاحب بڑا کرم فرماتے رہے، ممبئی کے کرم فرماؤں کے نام لکھوں تو کئی چھوٹ جائیں گے، ان سب کی عنایتیں یاد رہیں گی۔ ڈاکٹر اسحاق جم خانہ والا نے ۳۰ مارچ کو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اس کے ارکان سے میری ملاقات اور تبادلۂ خیال کا پروگرام رکھا تھا، اس خوشگوار تقریب میں پروفیسر خورشید نعمانی کے ہمراہ گیا اور ان کے اور جناب رضوان فاروقی اور جناب معین الحق کے ہمراہ اپنے مستقر پر واپس آیا، انجمن اسلام ممبئی مہاراشٹر کا سب سے بڑا تعلیمی و تربیتی ادارہ ہے جس کے تحت ستر سے زیادہ تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں، اس کے ارکان کا جوش و ولولہ اور اخلاص قابلِ تحسین ہے۔

افسوس ہے کہ ممبئی کے پُر لطف سفر کی وجہ سے دار العلوم ندوۃ العلماء کے جلسۂ انتظامیہ منعقدہ ۲۰ مارچ میں شریک نہیں ہو سکا، اس کی مجلس نظامت نے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی جگہ مولانا سید محمد رابع ندوی کو دار العلوم کا ناظم بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا، انتظامیہ نے بھی اس کی توثیق کر دی ہے، مولانا سید محمد رابع اور دار العلوم ندوۃ العلماء لازم و ملزوم ہیں، ان کا ذہنی و دماغی سانچہ یہیں تیار ہوا ہے، ان کو اس سے عشق ہے اور اس کی محبت ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہے، شروع ہی سے وہ مولانا علی میاں کے زیرِ تربیت رہے اور عرصہ دراز سے ان کی رہنمائی میں ندوہ کے علمی و انتظامی کام انجام دے رہے ہیں، اس لئے یہ انتخاب بالکل مناسب و برجا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے اور ان کی قیادت میں ادارے کو مزید ترقی بخشے۔ آمین!

مقالات

عمید الدین ابونصر ابزری فارسی انصاری

مصنف قصیدہ اشکنوانیہ معاصر سعدی شیرازی

از جناب پروفیسر نذیر احمد صاحب ٭

عمید الدین ابی نصر ابزری[1] اتابک سعد بن زنگی (۵۹۱[2]-۶۲۳) کا فاضل وزیر تھا اور سلطنت کے سارے امور اسی سے متعلق تھے، وہ عربی و فارسی شاعری اور نثر نویسی میں کمال کا درجہ رکھتا تھا مگر بدنصیب تھا، اس لئے کہ اتابک سعد بن زندگی کی وفات کے بعد ہی اس کو قلعہ

---

[1] ابزر جس کا تلفظ افزر ہے، شیراز کے جنوب میں ۳۵ فرسخ پر واقع ہے، علامہ قزوینی نے شد الازار کے حاشیے ص ۲۱۵ میں لکھا ہے: ہو عمید الدین ابو نصر اسعد بن نصر بن جشیار بن ابی شجاع بن حسین بن زجان فالی ابزری وزیر آتابک سعد بن زنگی (۵۹۴-۶۲۳) و صاحب قصیدہ معروف اشکنوانیہ وی از فضلاء مشہور عصر خود بودہ و با امام فخر رازی معاصر و ما بین ایشان مکاتباتی راجع بہ مسائل علمیہ شدہ بودہ و راقم این سطور عکسی ازین مکاتبات .. بدست آوردہ ولی فعلاً بدان دسترسی ندارم (شد الازار حاشیہ ص ۲۱۵-۲۱۶) [2] شیراز نامہ ص ۴، سے معلوم ہوا کہ سعد بن زنگی تکلہ بن زنگی کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا اور تکلہ کی وفات ۵۹۱ھ لکھی ملتی ہے لیکن شد الازار ص ۲۱۵ میں سعد بن زندگی کی ابتدائے حکومت ۵۹۴ھ درج ہے۔

٭ سابق صدر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی، ۴/۶۴۵۔ سر سید نگر۔ علی گڑھ۔

اشکنوان[1] تھا قید کر دیا گیا، یہ فارس کا مشہور قلعہ تھا، اسی قلعے میں اس نے ایک نہایت طویل[2] قصیدہ لکھا جس میں اپنی برأت کے لئے التماس اور جس میں اپنے کو بے قصور ثابت کیا ہے۔

سعد بن زنگی اور اس کے بیٹے ابوبکر بن سعد میں اختلاف ہوا تو جنگ[3] کی نوبت آگئی، اس میں ابوبکر کو شکست ہوئی اور وہ قید کر دیا گیا، ۶۲۳ھ میں آتابک سعد کی وفات ہوئی تو آتابک ابوبکر تخت نشین ہوا[4] تخت پر بیٹھتے ہی اس نے عمیدالدین ابونصر ابزری سے بدلہ لینے کی ٹھانی، چنانچہ چند روز بعد آتابک ابوبکر نے عمیدالدین کو فارس کے مشہور قلعہ اشکنوان (فارس نامہ ناصری ۲: ۳۳۲، آثار عجم ۲۲۲ - ۲۲۵) میں قید کر دیا[5]، اس کے ساتھ اس کا

---

[1] اشکنوان فارس کا مشہور قلعہ تھا، دیکھئے شدالازار ص ۲۱۶، ۳۳۳، ۵۱۹، ۵۲۱ وغیرہ اشکنوان واستخر وقلعہ شکستہ سہ قلعہ بود در حوالی شہر استخر بر روی سر کوہ مجموع آنہار اسہ گنبدان می گفتند۔ (دیوان کمال مقدمہ ص ۴۴) [2] اشکنوان کی نسبت سے یہ قصیدہ اشکنوانیہ کے نام سے مشہور ہوا اس میں ۱۰۹ یا ۱۱۱ اشعار ہیں [3] سلطان محمد بن تکش والی خوارزم نے ۶۱۴ھ میں عراق پر حملہ کیا تو آتابک سعد بن زنگی اس مقابلے کے لئے آگے بڑھا اور خوارزم شاہ کی فوج کو بھگا دیا، لیکن آتابک خود گھوڑے پر گر پڑا اور خوارزم شاہیوں کے ہاتھ پڑ گیا، سلطان محمد بن تکش نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا اس نے آتابک کی بیٹی ملکہ خاتون کو اپنے بیٹے جلال الدین کے لئے نامزد کرا کر سعد بن زنگی کو شیراز لوٹا دیا یہاں آتابک سعد کی غیبت میں امرائے شیراز نے آتابک کے بیٹے ابوبکر بن سعد کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور جب آتابک سعد لوٹ رہا تھا تو اس پر حملہ کر دیا آتابک سعد کے ساتھ خوارزمی سپاہ کا دستہ تھا اس نے ابوبکر کی فوج کو پسپا کر دیا آتابک ابوبکر نے باپ پر ضرب لگائی، مگر اس کا اثر نہ ہوا آخر میں سعد نے اپنے بیٹے کو پکڑ لیا اور قید کر دیا (شیراز نامہ ص ۳۷ - ۴۷) [4] ابوبکر بن سعد ۱۲ ذی قعدہ ۶۲۳ھ کو تخت پر بیٹھا تھا (شدالازار ص ۲۱۶ حاشیہ) [5] یکم ذی الحجہ ۶۲۳ھ عمید کے قید کی تاریخ ہے (ایضاً)۔

بیٹا تاج الدین محمد بھی محبوس تھا، عمیدالدین کو چند ماہ بعد[1] قتل کر دیا لیکن تاج الدین محمد رہا ہو گیا، قید ہی میں عمیدالدین نے ایک نہایت فصیح و بلیغ قصیدہ لکھا، قید خانے میں قلم دوات وغیرہ کچھ نہ تھا، کوئلے سے دیواروں پر اشعار لکھے گئے جن کو بیٹے نے ازبر کر لیا اور قید سے رہائی کے بعد قصیدے کے متن کو[2] درست کیا گیا، پھر اس پر مفصل شرح لکھی گئی، اس کے نتیجے میں علمی دنیا میں اس کی بڑی شہرت ہوئی، یہی نظم قصیدہ اشکنوانیہ کے نام سے عالمگیر شہرت کی مالک ہوئی۔

تاریخ وصاف[3] میں عمیدالدین کے سلسلے کی تفصیل درج ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

آغاز میں آتابک سعد بن زنگی کا وزیر رکن الدین صلاح کرمانی تھا اور آخر میں عمیدالدین ابونصر ابزری ہوا، عمیدالدین مرد فاضل تھا، عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا، دونوں کا دیوان موجود ہے ایک بار رسالت کے طور پر سلطان محمد خوارزم شاہ کے یہاں گیا، سلطان نے اس کی بڑی تکریم کی اور اس کو سنہری کرسی پر بٹھایا... خواجہ عمیدالدین نے[4] استادالبشر خواجہ امام فخرالدین عمر رازی سے دوستی پیدا کی اور مراسلت کا آغاز کیا، اور قصہ سلامان وابسال کے قصے کے اشکال کو دور کیا، یہ قصہ نفس ناطقہ کا استکمال ہے۔

آتابک سعد ۶۱۴ھ[5] میں حدود رے گیا اور سلطان محمد خوارزم شاہ پر حملہ کیا اور

---

[1] جمادی الاول یا جمادی الثانی ۶۲۴ھ قتل کی تاریخ ہے (شدالازار ص ۲۱۶ حاشیہ) [2] لیکن عمید کی رہائی میں نہ اس قصیدے کا کچھ اثر ہوا اور نہ ان اشعار کا جو اس نے قید سے بھیجے تھے۔ اشعار یہ ہیں:

ای وارث تاج و مملکت و افسر سعد — بخشائے خدا بہ جان و سر سعد

بر من چو کہ نام خویشتن تا ہستم — ہمچو الف ایستادہ ام بر سر سعد (شیراز نامہ ص ۸۱)

[3] تحریر تاریخ وصاف ص ۸۷ [4] ایضاً [5] ص ۸۹۔

اس کے لشکر کو شکست دی، خوارزم شاہ آتابک کی بہادری و دلاوری سے بہت متاثر ہوا، اور اپنے سرداروں سے کہا کہ اگر وہ گرفتار ہوجائے تو اس کو قتل نہ کیا جائے اور زندہ میرے پاس لایا جائے۔ قضارا آتابک کا گھوڑا گر پڑا، چنانچہ خوارزم شاہیوں نے آتابک کو پکڑ لیا اور سلطان کے سامنے لے گئے، سلطان اس کی دلاوری سے بے حد متاثر ہوا اور اس کو ایک بڑے خیمے میں شاہانہ طور پر رکھا، چنانچہ آتابک وہاں شاہانہ طور پر رہنے لگا اور اسے جو کچھ تحفے تحائف آتے سب امرا میں تقسیم کردیتا، اس کی وجہ سے خوارزم شاہ اس سے بے حد متاثر ہوا اور مجلس بزم میں آنے جانے کی اجازت دی، آخر قرار پایا کہ آتابک اپنی بیٹی ملکہ خاتون کا عقد سلطان کے بیٹے سلطان جلال الدین کے ساتھ کرے اور اپنے بیٹے زنگی کو بطور گروگان[1] کے سلطان کے پاس چھوڑے اور ممالک فارس کے محصولات کا ایک تہائی سلطان کے خزانے میں بھجوائے اور استخر اور اشکنوان دونوں قلعے خوارزم شاہ کو سپرد کرے۔

آتابک سعد کے بیٹے ابوبکر[2] کو جب ان امور کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت غضبناک ہوا اور کہا میرے باپ نے ہمارے موروثی ملک کو برباد کردیا، پس اس نے اپنے باپ آتابک سعد پر حملہ کرنے کی ٹھانی، آتابک سعد خوارزم سے واپس آرہا تھا تو بیٹا اس کے استقبال کے بہانے سے نکلا اور اس کے ساتھ کافی لوگ تھے، انہوں نے آتابک سعد پر حملہ کردیا اور اس کے ساتھ خوارزمیوں کا جو حفاظتی دستہ تھا اس کے نو آدمیوں کو مار ڈالا، آخر میں آتابک سعد کے ساتھ جو فوج بچی تھی اس نے ابوبکر بن سعد کو شکست دی پھر وہ پکڑا گیا اور قلعہ اصطخر میں قید کردیا گیا، آتابک سعد حکومت کرنے لگا اور

[1] کوئی چیز یا شخص قرض کے بدلے گروی رکھا جائے [2] ص ۹۰۔

سلطان محمد خوارزم شاہ سے رابطہ بڑھایا، اپنی بیٹی ملکہ خاتون کو ساز و سامان کے ساتھ خوارزم بھیجا، کچھ دنوں بعد آتابک سعد کی وفات ہوگئی، اس کی وفات پر اس کا بیٹا آتابک ابوبکر قید سے نکالا گیا اور وارث تخت قرار پایا، یہ واقعہ ۶۲۳ھ کا ہے، آتابک کو عمیدالدین ابزری وزیر آتابک سعد سے بڑی رنجش تھی، چنانچہ تخت نشین ہونے کے چند ماہ کے اندر ابزری کو قلعہ اشکنوان میں قید کردیا اور چند ہی ماہ کے اندر اسے پھانسی دی، عمید نے ایک رباعی اپنی برأت کے لئے آتابک کے پاس بھیجی جو اس طرح پر ہے:

ای[1] وارث تاج و ملکت و افسر سعد الخ

لیکن یہ بے اثر ثابت ہوئی۔ پھر قید خانے ہی میں قصیدہ اشکنوانیہ[2] لکھا، لیکن قلم سیاہی وغیرہ کے نہ ہونے کی بنا پر کوئلے سے دیوار پر اشعار لکھے گئے، ان اشعار کو عمید کے بیٹے تاج الدین محمد نے جو باپ کے ساتھ محبوس تھا، از بر کرلیا، ۶۲۳ھ میں عمید کو پھانسی دے دی گئی مگر بیٹا چھوٹ گیا، یہ قصیدہ فصاحت و بلاغت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا، مطلع یہ ہے:

من یبلغن حمامات ببطحاء ممتعات بسلسال وخضراء

یہ اشعار عمید کے بیٹے تاج الدین محمد باپ کی ہدایت کی بنا پر خود عمید کے ماموں زاد بھائی امام[3] المتبحرین صفی الدین ابوالخیر مسعود سیرافی کے پاس لے گئے، انہوں نے اشعار کی ترتیب درست کردی، پھر صفی الدین سیرافی کے نامور بیٹے مولانا قطب الدین[4] محمد نے

[1] دیکھئے شیراز نامہ ص ۸۱ [2] ایضاً نیز رک: شدالازار حاشیہ ص ۲۱۶، ۴۳۲، ۵۱۷ بعد [3] ان کے حالات کے لئے دیکھئے شدالازار ص ۴۳۰ بعد [4] دیکھئے شدالازار ص ۴۳۰، ۴۳۳، ۵۱۷-۵۲۱۔

قصیدے کی ایک مشہور شرح لکھی۔

یہ تفصیلات تاریخ وصاف سے لی گئی ہیں جو اس سلسلے کا سب سے قدیم اور معتبر ماخذ ہے، اس سلسلے کا دوسرا قدیم ماخذ قطب الدین محمد سیرانی فالی کی شرح قصیدہ اشکنوانیہ ہے، شارح قصیدہ عمیدالدین اسعد ابی نصر ابزری ناظم قصیدہ کے ماموں زاد بھائی صفی الدین سیرانی کا فاضل بیٹا تھا، صفی الدین اور قطب الدین دونوں باپ بیٹوں کا مفصل اور قابل اعتماد تذکرہ شد الازار میں ہے، اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین اقسام علوم میں بڑا کمال رکھتا تھا، اس نے اپنی تمام عمر علم کی خدمت میں صرف کی، بیس سال کی عمر سے تدریس میں لگ گیا، برسوں درس و تدریس اس کا محبوب مشغلہ رہا، عمر زیادہ ہوئی تو تصنیف و تالیف میں مشغول ہوا، اس کی مشہور تصانیف میں حسب ذیل کتابوں کا نام ملتا ہے:

کتاب تقریب (تفسیر)، توضیح حاوی (فقہ)، شرح توضیح (فقہ)، شرح لباب شرح قصیدہ اشکنوانیہ، کتاب الاغراب۔

ہمارے موضوع کے اعتبار سے قطب الدین کی شرح قصیدہ اشکنوانیہ کافی اہم ہے، قصیدہ اشکنوانیہ قصیدہ عمیدیہ بھی کہلاتا ہے، اس لئے کہ اس کا ناظم عمیدالدین ابی نصر ابزری وزیر اتابک سعد تھا اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، یہ قصیدہ قید کی حالت میں نظم ہوا تھا اور قید خانے میں قلم دوات کے نہ ہونے کی بنا پر کوئلے سے دیوار پر لکھ دیا گیا تھا، پھر عمیدالدین کے بیٹے تاج الدین محمد نے جو باپ کے ساتھ محبوس تھا، اسے ازبر کر لیا، باپ تو چند ماہ بعد قتل کر دیا گیا، لیکن بیٹا چھوٹ گیا، اس کے واسطے سے یہ قصیدہ عمیدالدین ابزری کے ماموں زاد بھائی صفی الدین مسعود سیرانی کو پیش ہوا تو

اس نے اس کی ترتیب درست کر دی، پھر یہ قصیدہ سارے ملک میں مشہور ہو گیا، قصیدے کی شرح صفی الدین کے فاضل فرزند قطب الدین محمد نے کی، یہ شرح کافی مقبول ہوئی، اس سے قصیدے کی شہرت میں اضافہ گیا، شرح کے متعدد نسخے آج بھی پائے جاتے ہیں، ان میں دو قدیم اور کافی اہم ہیں، ایک نسخہ جس کی کتابت صفر ۷۴۳ھ میں ہوئی، مشہد مقدس کے کتاب خانے میں محفوظ ہے، دوسرا قدیم نسخہ جو آخر سے ناقص ہے مجلس شورائے ملی تہران میں ہے، علامہ عبدالوہاب قزوینی نے شرح کے مقدمے کو ان دونوں نسخوں کی مدد سے شد الازار کے حواشی ص ۵۱۸ پر نقل کیا ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر وہ مقدمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"اما بعد فان مولانا الصاحب السعید المجتهد الشهید علامة زمانه ونادرة اوانه الذی کان جنابه مربع الفضائل ومرتع الافاضل یفزع الی فنائه المتبحرون من کل صوب وینحدر الی بابه المحققون من کل ادب عمید الحق والدین اسعد بن نصر الفارسی الانصاری سقی الله مثواه ونضر محیاه ورضی عنه وارضاه کان فی زمن الملک المؤید المظفر الکامل مولی ملوک العالمین مظفر الدنیا والدین سعد بن زنگی اظهر الله برهانه واسکنه جنانه واعلی شانه وزیراً یدور رحی الدولة بیر بصائب آرائه تنتظم مصالح الجماهیر فی سلک غنائه ومضائه یقوم بنافذ حکمه اقطار الممالک ویجلوا بانوار عدله ظلام الظلم الحالک ویقتضد بتعزز مکانه اکناف فارس وارجاؤها ویعتمد علی رفعة شانه ارباب الفضائل وابناؤها

فلله در القائل:

ام الوزارة ام جمة الولد   لکن بشکلک لم تحبل ولم تلد

فلما انتقل الی جوار الله الملک العادل انار الله برهانه فی قلعة
بهاتزاد[2] لیلة الاربعاء الثانیة عشرة من ذی القعدہ لسنة
ثلاث وعشرین و ستمائة جری علی الصاحب السعید ما شاع فی
العٰلمین خبرہ وکان ما کان مما لست اذکرہ وانتهی امد ولایته
وسیاسته وقص قضاء الله جناح زعامته وریاسته فقبض علیه
فی یوم الاحد غرة ذی الحجه سنة ثلاث وعشرین وستمائة و
ذهب به الی قلعه اشکنوان من فارس بعد شهر ابنه الصاحب
السعید تاج الدین محمد تغمدہ الله بغفرانه واستشهد وحدہ
هناک قدس الله روحه فی احدی الجمادیین من سنة اربع وعشرین
وستمائة وکان رضی الله عنه انشا هذہ القصیدة الغراء فی القلعة
ولم یکن عندہ دواة ولا قلم بل املاها علی ابنه تاج الدین محمد وکان
یحفظها فلما انزل رواها لمولای و والدی و امامی امام المسلمین
حجة الله علی بریته اجمعین مفسر التنزیل مقرر التاویل استاذ اکابر
المتبحرین صفی الحق والدین ابی الخیر مسعود[1] بن محمود بن ابی الفتح
السیرافی قدس الله روحه الی فتوحه وکان والدی برد الله

۱؎ اس کے حالات کے لئے دیکھئے شد الازار ص ۴۳۰، شمارہ ۲۹۸، ح ۲ ص ۴۳۰، وشیراز نامہ۔ ۲؎ قلعہ بهاتزاد کے لئے دیکھئے شد الازار ص ۱۵۸ حاشیہ ۳۔

مضجعه ابن خال الصاحب السعید عمید الدین رضی الله
عنهما فرتب ابیاتها واغتنم نقلها واثباتها فانتشرت وشاعت
فی الآفاق وتناقلها فضلاء خراسان والعراق بل قد اخبرنی
من اثق به من الائمة الواردین من بلاد الشام ان هذہ القصیدة
یدرسها اکابرهم ویحفظها اصاغرهم ولعمری انها عند
تامل الناقد البصیر جدیرة بانواع الاحترام والتوقیر لما فیها
من اللطائف العزیزة والفوائد الکثیرة والنکت اللطیفة
والرموز الشریفة فاقترح علی جماعة من اکابر الرفقاء واجلة
الاخلة ان اشرح لهم هذہ القصیدة شرحاً یکشف القناع
عن مضمونها ویحسر اللثام عن مکنونها فاستخرجت الله تعالیٰ
مستعینا فی ذلک بهدایة متوکلاً علی حسن عنایة وهو حسبنا الله و
ونعم الوکیل قال رضی الله عنه:

من[1] یبلغن حمامات ببطحاء   ممتعات بسلسال وخضراء

الحمام عند العرب ذوات الاطواق من نحو الفواخت والقماری الخ"

جیسا کہ اوپر درج ہو چکا ہے عمید الدین ابی نصر ابزری نے قصیدہ اشکنوانیہ حبس
میں لکھا تھا، اس کے چند دن بعد وہ قتل کر دیا گیا، البتہ اس کا بیٹا تاج الدین محمد رہا ہو گیا۔
بیٹے کے واسطے وہ قصیدہ ابزری کے ماموں زاد بھائی صفی الدین مسعود سیرانی کے پاس
پہنچا۔ اس نے قصیدہ کے اشعار کی صحیح ترتیب دی، پھر اس کے بیٹے قطب الدین محمد

۱؎ قصیدہ اشکنوان کا مطلع ہے۔

سیرافی نے اس قصیدے کی نہایت فاضلانہ شرح لکھی، اس شرح کے متعدد نسخے ہنوز موجود ہیں اور دو قدیم نسخے بھی مشہد اور تہران میں پائے جاتے ہیں، غرض ان وجوہ سے قصیدۂ اشکنوانیہ فضلائے آفاق کے درمیان مشتہر ہوگیا۔ قصیدے کی شرح کے نسخے تو پائے جاتے ہیں لیکن ابھی وہ طبع نہیں ہوئی، البتہ قصیدے کا متن شایع ہوچکا ہے یہ متن معلقات سبع چاپ تہران ۱۲۷۲ھ کے آخر میں چھپ چکا ہے۔ نیز یورپ میں ۱۸۹۳ء میں مجلہ "سامی" میں فرانسیسی مستشرق کلمنٹ ہوارٹ کے اہتمام سے طبع ہوا ہے۔

(شد الازار حاشیہ ص ۲۱۶) قصیدے کے اشعار کی تعداد ۱۰۹ یا ۱۱۱ ہے۔

عمید الدین اسعد ابزری نے قلعہ اشکنوان کے حبس میں چند چیزیں لکھی تھیں، ان میں تو ایک قصیدہ اشکنوانیہ ہے جس کی تفصیل اوپر درج ہوچکی ہے، اس وقت ان کے پاس نہ قلم تھا نہ دوات، حبس کی دیوار پر کوئلے سے لکھا گیا ہے، ایک دوسری طویل نثری تحریر بھی ملی ہے جس میں عمید الدین نے شیراز کے فضلاء کو مخاطب کیا تھا۔ اس میں بھی اپنی خستہ حالی کی شکایت کی ہے، اس مکتوب سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ اس وقت ایران میں قید خانوں کی کیا حالت تھی یہ طویل مکتوب فارسی نثر میں ہے جس کو علامہ قزوینی نے شد الازار کے بخش حواشی ص ۵۲۲ تا ۵۲۶ درج کیا ہے، اس مکتوب کی اہمیت کے پیش نظر پہلے اس کا فارسی متن پھر اردو ترجمہ پیش کیا جائے گا۔

یہ مکتوب ایک نہایت قدیم بیاض میں شامل ہے جو آقای حسین باستانی کی ملکیت ہے اور تہران میں پائی جاتی ہے، اس کا خط درست ہے لیکن مخطوطے میں تاریخ کتابت درج نہیں، تاہم کاغذ، خط اور املا سے ظاہر ہوتا ہے کہ یقیناً ساتویں صدی ہجری کے بعد کا نہیں ہوسکتا۔

"نسخہ کہ وزیر عمید الدین اسعد بن نصر الفارسی نوشتہ است از حبس قلعہ اشکنوان

زندگانی اولیاء نعم صدور و اکابر عالم در تواتر نعمت و ترادف دولت دراز باد و حق جل و علا در کل احوال حافظ و معین، معلوم رای اکابر و صدور باشد کہ الغریق یتعلق بکل شی والعاشق یطوف علی کل حی کسی کہ در غرقاب ہالک و گرداب قاتل افتاد ما دام تا نیم جانی در مضیق قالب او ہیجان می کند از غایت حب حیات در طلب خلاص و نجات دست و پائی می زند و بہر وجہ کہ ممکن گردد دست آویزی می جوید و اگرچہ فلاحی و نجاحی روی ننماید بر قدر استطاعت سباحتی می کند و ہر شجرہ ثابت و راسخ کہ بر ساحل مشاہدہ می کند بہ مجاہدہ کلی خویشتن را بہ جانب آن می افکند تا باشد کہ باصول متین و فروع وثیق او تعلقی سازد و بعد ما کہ در منصب می بود کہ وہو القاہر فوق عبادہ تا امروز کہ بدین فجیعہ کی عبرت اوایل و اواخر است مبتلا گشت و بدین نکبت کہ تذکرہ و تنبیہ عقلاء عالم است درماند و در قعر چاہ ظلماتی زندہ بگور شد و ہر مردہ را کفنی باشد و یا لیت کہ درین گور ظلماتی کفنی بودی تا سر از این چاہ نمناک از این تن غمناک باز داشتی و شب و روز در قعر چاہ از نور خرشید و ماہ بی بہرہ می باشم نہ روز از شب باز می دانم و نہ شب از روز باز می شناسم گوئی سمع جذر اصم شدست کہ ہرگز آوازی بوی نمی رسد گوئی بصر مقلا کمہ شدست کہ ہیچ لون را ادراک نمی کند ہیچ نمی دانم تا این جان آہنین این قالب سنگین مرا چرا وداع کند ہیچ معلوم نیست کہ این روزگار بدخو این عمر ستیزہ روی را چہ سبب در انقراض زوال نمی کشد شعر

الا موت یباع فاشتریہ فہذا العیش ما لا خیر فیہ

الارحم المہیمن روح عبد — تصدق بالممات علی اخیہ[1]

دربیع و شرا عظیم بشتافتمی — گر بیع اجل را ببہا یافتمی

از تر و خشک جہان وظیفہ بامداد و شبانگاہ یک تا ئی نان خشکست و از عین
جیحون راتبہ شربت و طہارت یک کوزہ آب

شعر

افیضوا علینا من الماء فیضا — فانا عطاش و انتم ورود[2]

واگر خادم مخلص شرح ہر نکبتی و حکایت ہر شدتی و محنتی گوید طبع مخدومان را
عز نصرہم ملال افزاید و چون امروز مخدوم و خداوندان در مسند مراد و متکای
اقبال و انواع سعادت کہ ہمیشہ چنین باد بمداوات رنجور و معالجت مہجور کمتر
التفات نمایند اما توقع ذاتی و عواطف جبلی آنست کہ فرمان صاحب شریعت
علیہ التحیۃ والصلوۃ مرآت کل اوقات خود سازند کہ استماع کلام الملہوف

---

[1] از جملہ چہار بیتی است از حسن بن محمد مہلبی وزیر معزالدولہ دیلمی کہ ابن خلکان
ج ۱، ص ۵۵۔ بوی نسبت دادہ است و بیت ثانی در آنجا اینگونہ است، الارحم المہیمن
نفس حر تصدق بالوفاۃ علی اخیہ [2] از جملہ چہار بیتی است از خلف بن احمد
قیروانی شاعر کہ یاقوت در معجم الادبار، ج ۴، ص ۱۷۸، باو نسبت دادہ و
ابیات اینست۔

ہل الدہر یوما بلیلی یجود — و ایامنا باللوی ستعود

عہود تقضت و عیش مضی — بنفسی و اللہ تلک العہود

الا قل لسکان وادی الحمی — ہنیئاً لکم فی الجنان الخلود

افیضوا علینا من الماء فیضا — فنحن عطاش و انتم ورود

صدقہ و این قرین بلا رد ہر و ہم نشین عنا[1] عصر را بعنایتی دست گیرند، این خادم
در بسیط کاینات مستغاث[2] الا الی رحمت و عاطفت ربانی روزگار می گذاشت و در
احداث ایام و اضغاث احلام روزی بشب و شبی بروز می آورد و بحکم مساعدۂ
اتفاقات حسنہ بعراقی ہمہ بنی آدم ترقی می نمود و بہر خلاصہ امانی کہ امثال خادم
را بود بامداد لطف ربانی می رسید و بہ منصب و مرتبہ کہ اہلیت آن داشت یا
نداشت بخت موافقت می نمود و للہ فی کل یوم یوم و در ظل دولت پادشاہ
روی زمین مخدوم ملوک و سلاطین عالم اعز اللہ انصارہ و ضاعف اقتدارہ
جملہ اقبال بدست آورد و بانوار دولت او سنگ امیدم یاقوت احمر گشت و ہر
تخمی کہ بدست مراد در چمن سعادت پاشیدم شجرۂ مفاخرہ و معالی و محظم آب
و ماثر گشت، اما خادم دولت مست گشت و ظن برد کہ اعتدال ہوا ربیعی از صرصر
خزان ایمن شدہ ماند و یا صبح اعمار اشب آجال در پیش نیست و یا مگر صاف
لذات را درد بلیات در عقب نخواہد بود و خبر نداشت کہ ان اللہ یمہل ولا
یہمل و بی خبر ازین خبر کہ صاحب شرع علیہ الصلوۃ والسلام فرمود اتقوا دعوۃ

---

[1] از اینجا یعنی از کلمہ "عصر" تا آخر این مکتوب چون سوادی کہ من خودم از روی نسخہ اصل
آقای باستانی را برداشتہ بودم مفقود شدہ بود و بنسخہ اصل ہم دیگر دست رسی نداشتم
لہذا این بقیہ را از روی سوادی کہ از ہمین نامہ یکی از دوستان آقای اقبال برداشتہ بود
سواد برداشتہ ام نہ از روی اصل نسخہ آقای باستانی را، و بنا براین از اینجا ببعد ہر جا
"کذا فی الاصل" میگویم مقصودم از "اصل" سواد مشارالیہ است نہ اصل نسخہ قدیمی جنگ، این
مطلب را نباید از نظر دور داشت [2] کذا فی الاصل (؟)

المظلوم فانها لاترد و گمان برد که این نکات وعید و کلمات تهدید که در مضمون مصحف مجید ست منسوخ و متروک گشته است ولاتحسبن اللّٰہ غافلاً عما یعمل الظالمون و بهیچ وقت بر دل و خاطر نمی گذشت که وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون و پیراهن کاغذین شکل که به حیله خواجگی و تکلف بشری از عوارض مشتی درویش ساخته بود و در میان جماعتی اوباش خود را در آن جلوه گری کرده و بدستاری که مقنعه بر آن فضل داشت مغرور مانده و می پنداشت که باران حوادث جهان و طوفان نوائب زمان را دفع تواند کرد یا تیری که مظلومان در وقت سحر بر کمان بیچارگی و تضرع نهند و بر هدف آه امن یجیب المضطر اذا دعاه اندازند بواسطۂ پیراهن دفع تواند نمود و البته این آیت نمی خواند کران اخذه الیم شدید و [مراعات] این کلمه شما مخدومان بسبب نگاه داشت جاه و صدقه دولت خداوندجهان واجب دانند[1] [که]:

وادّ زکوة الجاه واعلم بانها   کمثل زکوة المال لابد واجب

و بدین بیچارگی و تضییع عمر و اطفال خرد و دین و دنیا که خسارت کرده است مساهلتی فرمایند ادام که قدرت دارند فریادرسی واجب شمرند حقوق صحبت و ممالحت از مواجب است و مجروحان را مرهم نهادن از لوازم درمانده شدم برنج و ستم گیرید خلاصه آمد و از خدمت مخدومان و کریمان اقتراح کرده می شود که چون در مضیق حبس خواهند داشت و این بند بلا ازین پای مبتلا[2] بر نخواهند گرفت

---

[1] کذا فی الاصل، معلوم نیست که فعل "دانند" بصیغه جمع غائب چگونه فاعل آن ضمیر "شما" در سطر قبل بصیغه جمع مخاطب آمده است (د)، [2] کذا فی الاصل، ؟ مبتلی۔

و بجرمی که نکرده ام حدی خواهند زد آنچه ملتمس است از انعام دریغ ندارند و این قصه که از غصه روزگار نوشته است برخوانند و برای نجات را شفاعتی طلبند[1] بمستحفظ قلعه تقدمی فرمایند تا خادم را ازین قعر چاه مظلم که منزل شب و روز دائم است بموضعی دیگر نقل کنند بدان قدر موضعی که خشتی هم از زمین میسر گردد و آن قدر که وظیفه افطار ست یک تای نان دیگر در افزایند و کوزۂ آب که راتب طهارت و شربت است با دو کوزه فرمایند که یک کوزه خوردن و طهارت ساختن را متعذر ست و این جماعت عیالکان و طفلکان که ستم زدگان اند بشفقت و رافت خویش مخصوص گردانند و خطاب ربانی که فاما الیتیم فلا تقهر کار بندند چون کریمان رعایت حقوق یتیمان از فرائض روزگار و مواجب ایام سیادت شمرند و بجرم گناه کاران بی گناهان را از عاطفت و شفقت محروم نگردانند که روزگار مرکبی توسن است در زیر لجام هیچ رائض نرم نشود و دولت معشوقی بی وفاست روزی چند بیش با عاشقان آرام نگیرد و از روزگار آدم علیه السلام الی یومنا هذا هر که خیری کرد و احسانی نمود نقش آن از تختهٔ ادوار لیل و نهار محو نگشت و هر که سنتی بد نهاد مساوی تبعات آن از خواطر و اوهام فراموش نشد قوله تعالیٰ من عمل صالحاً فلنفسه ومن اساء فعلیها ایزد تعالیٰ روزگار اولیاء نعم و دولت را از امثال این حال که خادم را افتاد مصون و محروس داراد بمنه و سعة فضله انتهی۔

و در ختام این نکته را نیز نگفته نگذریم که دو شاعر معروف رفیع الدین لبنانی اصفهانی و کمال الدین اسمٰعیل اصفهانی را در حق صاحب ترجمه مدایح غراست که در دواوین

---

[1] کذا فی الاصل بتاء مثناة فوقانیه، و شاید صواب "یا" بمثناة تحتانیه باشد (د)۔

آنان مثبت است ۔

ترجمہ :۔ [یہ وہ مکتوب ہے جو وزیر عمید الدین اسعد بن نصر الفارسی نے تلور اشکنوان کے حبس سے بھیجا، خدا کرے بڑے بڑے صدور اور اکابر عالم کی زندگی تواتر نعمت اور تسلسل دولت کے ساتھ دراز ہو۔

ان اکابر وصدور کو معلوم ہو کہ پانی میں ڈوبتا ہوا شخص ہر چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے اور عاشق ہر زندہ شئے کے قریب پھٹکتا رہتا ہے، جو شخص ہلاکت والے غرقاب اور ڈبو دینے والی بھنور میں پھنسا، جب تک تھوڑی سی جان باقی ہے، جان کی بنا پر خلاص اور نجات کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے اور ہر ممکن طریقے سے کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے اور اگرچہ کامیابی نظر بھی نہ آئے تو بھی وہ اپنی استطاعت بھر تیرنے کی سعی کرنے لگتا ہے اور اگر کوئی درخت ساحل پر نظر آتا ہے تو پوری کوشش سے اس طرف لپکتا ہے تاکہ درخت کا تنہ یا جڑ اس کے ہاتھ میں آجائے۔

بندہ پہلے صاحب منصب اور صاحب اقتدار تھا۔ اس وجہ سے اکثر لوگوں پر تفوق رکھتا تھا، اقتدار کے ختم ہونے سے آج تک ایسی مصیبت میں گرفتار ہے جو اوائل اور اواخر کے لئے باعث عبرت اور عاقلان عالم کے لئے موجب تنبیہ ہے، وہ مصائب میں گرفتار اور اندھے کوئیں کی تہ میں زندہ درگور ہے، وہ ہر مردہ کے لئے کفن ہے، کاش کہ اس اندھیری قبر میں اسے کفن ہی میسر آجاتا جس سے وہ اس تر کنوئیں کی ٹھنڈک سے محفوظ ہو سکتا۔

اسے دن ورات کنوئیں کے اندھیرے میں نہ سورج کی روشنی میسر ہے نہ چاند کی، اس کی بنا پر اس کے لئے دن ورات میں کوئی فرق نہیں، پٹ بہرہ ہو چکا ہے قوت شنوائی بالکل ختم ہو چکی ہے کوئی آواز کان میں نہیں پہنچتی، قوت باصرہ بھی ختم ہو چکی ہے، بالکل

اندھا ہے، کوئی رنگ بھی نہیں پہچانتا، سمجھ میں نہیں آتا یہ سخت جان آہنی بدن کی قید سے کیوں نہیں نکل جاتی، یہ بات بھی سمجھ سے باہر ہے کہ زمانہ ستیزہ رو عمر کو زوال کے گڑھے میں کیوں نہیں ڈھکیل دیتا۔

[اگر موت خریدی جاسکتی تو میں بڑی تیزی سے اس کے خریدنے کے لئے اس طرف دوڑ جاتا]

اس دنیا کے ڈھیروں ساز وسامان میں صبح شام مجھے جو کچھ میسر ہے وہ ایک خشک روٹی ہے اور ٹھٹ مارتے جیحوں میں میرا حصہ ایک کوزۂ آب ہے جو پینے اور طہارت دونوں کے کام میں آتا ہے۔

[پانی سے مجھے کچھ فیض دلاؤ، اس لئے کہ میں پیاسا ہوں اور تم پانی کے چشمے کے گھاٹ]

اگر یہ خادم اپنی تمام پریشانیوں اور مصیبتوں کا حال اپنے مخدومین کی خدمت میں بیان کرے تو انہیں ملال ہوگا اور آج یہ مخدومین اقبال اور سعادت کے مسند پر بیٹھے ہیں۔ خدا کرے ان کی یہ حالت باقی ہے اور انہیں مصیبت زدہ اور پریشان حال مجبوروں کی طرف متوجہ ہونے کا کم موقع ملتا ہے، لیکن توقع کی جاتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں گے۔ پریشان لوگوں کی باتیں سننا صدقہ ہے اور اس مصیبت زدہ اور الم رسیدہ پر عنایات کی نظر ڈالیں گے۔ خادم دنیا بھر میں رحمتوں کا خواستگار اور عاطفتِ ربانی کا طلب گار ہے۔ انہیں کی طلب اور آرزو میں اپنے دن گزار رہا ہے، شب وروز پریشان خیالات میں الجھا رہتا ہے اور اسی طرح مصائب کے دن کسی طرح کاٹ رہا ہے، اور کبھی کبھی ایسے بھی اچھے مواقع آجاتے ہیں کہ مصیبت زدہ آدمی بلند ہمتی کے زینے پر چڑھ جاتا ہے اور ہم جیسے خادموں کی جیسی امیدیں ہو سکتی ہیں وہ خدا کے فضل سے اسے حاصل ہو جاتی

ہیں ایسے منصب و مرتبہ پر جس کی اسے اہلیت ہوتی ہے یا نہیں بھی ہوتی ہے اس کی قسمت اسے پہنچا دیتی ہے۔ ہر قوم میں ایک دن اللہ کے لئے ہوتا ہے اور بادشاہ روئے زمین، مخدوم ملوک و سلاطین عالم، خدا اس کے مددگاروں کو معزز رکھے اور اس کا اقبال بڑھائے اس کے زیر سایہ اُسے جملہ کامیابیاں حاصل ہوئیں اور وہ طرح طرح کی دولت سے سرفراز ہوا گویا مخدوم ملوک کی دولت کے انوار کی بدولت میری آرزو کا پتھر یاقوت احمر میں تبدیل ہوا اور اس نے جو بھی بیج مقصود کے ہاتھ سے خوش نصیبی کے چمن میں بویا وہ مفاخر اور معالی کے شجر کی شکل میں رونما ہوا اور اس کے مراتب و مآثر میں اضافے کا موجب ثابت ہوا، اس کی وجہ سے یہ خادم دولت مست ہوگیا اور اس نے سوچا کہ بہار کا معتدل موسم خزاں کے جھونکے سے محفوظ ہوگیا، گویا اس کی زندگی کی صبحوں کے پیچھے اموات کی راتیں نہیں ہیں۔ یا شاید لذتوں کا صاف ستھرا پانی مصیبتوں کے تلچھٹ سے پاک ہے، اسے خبر نہیں کہ بیشک اللہ ڈھیل دیتا ہے، چھوڑ نہیں دیتا، وہ حضور سرور عالم کی اس حدیث کا علم نہیں رکھتا جس میں کہا گیا ہے کہ مظلوم کی آہوں سے ڈرو کہ وہ رد نہیں ہوتیں، اس نے خیال کیا کہ وعید و تہدید کے مضامین جو قرآن مجید میں ہیں وہ منسوخ و متروک ہوچکے ہیں اور اللہ کو غافل نہ جانیں ان کاموں سے جو ظالموں سے عمل میں آتے ہیں اور ان کے دل و دماغ میں کسی وقت نہیں آتا کہ عنقریب ظالموں کو معلوم ہوجائے گا کہ کون ہے جو ان کے حالات منقلب کردینے والا ہے اور کاغذی لباس جو خواجگی کے حیلے اور انسانی تکلفات کے انداز میں درویشوں کی محتاجی سے تیار ہوا ہے اور جس کے ذریعے وہ بچوں کی محفل میں اپنی شان اور سر پر دستار باندھ کر اپنا فضل جتاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دنیاوی حوادث کی بارش اور زمانے کے مصائب کے طوفان کو دفع کرسکتا ہے یا وہ تیر جو مظلوم لوگ صبح کے وقت

بے چارگی اور تضرع کے کمان چھوڑتے ہیں اور اس آہ کے نشانے پر نشانہ لگاتے ہیں۔ بھلا کون[1] پہنچتا ہے بیکس کی پکار کو جب اس کو پکارتا ہے اور خیال کرتے ہیں کہ پیراہن[2] سے اسے روک سکتے ہیں، وہ یہ آیت نہیں پڑھتے کہ اس کی پکڑ بڑی سخت اور تکلیف دہ ہے اور آپ مخدومین سے میری گزارش ہے کہ اپنے مراتب اور خداوند جہان کی حکومت کے صدقے میں اس کلمے کی رعایت واجب جانیں۔

عہدے اور مرتبے کی زکات ادا کرتے رہیں اور جان لیں کہ زکات جاہ اسی طرح واجب ہے جیسی زکات مال۔

اور (میری) اس بے چارگی، میری عمر اور چھوٹے بچوں کی تباہی اور میرے دین و دنیا کے خسارے سے مساہلت کریں اور جب تک قدرت ہو مظلوم کی فریادرسی واجب جانیں، تعلقات اور دوستی کے حقوق واجبات سے ہیں (ان کو ادا کرتے رہیں) مجروحوں کے زخموں کی مرہم پٹی لازم جانیں، میں رنج کی وجہ سے عاجز اور درماندہ ہوچکا ہوں میرا ہاتھ پکڑیے (میری مدد کیجیے)

مخدومین اور اہل کرم حضرات سے میری فی الفور درخواست کا خلاصہ یہ ہے کہ جب میرا جسم جکڑا جائے گا اور اس مصیبت زدہ کے پاؤں زنجیر میں کسے جائیں گے اور اس جرم کی جو مجھ سے سرزد نہیں ہوا، حد قائم کی جائے گی اس وقت مجھ پر کرم کی نظر سے محروم نہ کریں گے۔ اور یہ واقعہ جو زمانے کے ستم کی یادگار ہے، پیش نظر رکھیں، میری نجات کی سفارش کریں اور حاکم قلعہ کے پاس جاکر درخواست کریں کہ اس خادم کو اس تاریک کنوئیں سے

---

[1] قرآن سورہ ۲۷، آیت ۶۲۔

[2] ابوبکر سعد نے جب اپنے باپ سعد بن زنگی پر حملہ کیا تھا اور اس پر زخم لگایا تھا ضخامت لباس سے زخم کارگر نہیں ہوا تھا دیکھئے تحریر تاریخ وصاف ص ۹۰، اس سے ظاہر ہوا کہ لباس کی ضخامت زخم کے وار کو رد کرنے میں اثر انداز ہوتی ہے۔

جس میں وہ دن و رات مقید ہے، دوسری جگہ منتقل کر دیں، اس میں کم از کم اتنی گنجائش ہو کہ ایک اینٹ کی جگہ ہو سکتی ہو اور میرے کھانے میں (جو فی الوقت ایک سوکھی روٹی پر موقوف ہے) ایک اور روٹی کا اضافہ کر دیں اور ایک کوزۂ آب جو میرے پینے اور طہارت کے لئے مقرر ہے وہ ناکافی ہے (اس میں ایک اور کوزہ بڑھا دیں) اور میرے اہل و عیال جن پر بے وجہ ستم ڈھائے جا رہے ہیں، ان کو اپنی شفقت اور رحمت سے مخصوص کریں اور قرآن کی اس آیت[1] پر: سو جو یتیم ہو اس کو نہ ڈانٹو۔ عمل کریں اور کریموں کی طرح یتیموں کے حقوق کی رعایت فرائض روزگار اور مواجب ایام سیادت جانیں اور اس بے گناہ پر بے وجہ گناہ کا جرم عائد نہ کریں اور اس کو اپنی رحمت و شفقت سے محروم نہ کریں اس لئے کہ زمانہ تیز رفتار گھوڑا ہے جو کسی سائیس کے سخت لگام سے بھی نرم نہیں ہوتا اور دولت ایک بے وفا معشوق ہے۔ چند روز سے زیادہ عاشقوں کے ساتھ نہیں ٹھہرتی اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جس نے بھی کوئی بھلائی کی یا کسی کے ساتھ احسان کیا اس کا نقش دن و رات کے تختے سے محو نہیں ہوتا اور جس کسی نے بھی رسم بد کی بنا رکھی، وہ لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہوئی۔ قرآن مجید میں ہے: جس نے نیک کام کیا اس نے اپنی خاطر کیا اور جس نے برا کام کیا اسے اپنے لئے کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اولیائے نعمت کو اس حالت سے جس سے خادم دوچار ہے اپنے فضل و کرم کے صدقے محفوظ و مامون رکھے۔ بمنہ وسعتہ فضلہ۔

لیکن جیسا کہ لکھا جا چکا ہے آتابک ابوبکر بن سعد پر نہ وزیر کے دل ہلا دینے والے اشعار قصیدہ اشکنوانیہ کا اثر ہوا اور نہ اس مکتوب کا جس کے مخاطب آتابک کے علاوہ

---

[1] قرآن، سورہ ۹۳ آیت ۹۔

دوسرے ذی اثر و ذی حیثیت لوگ تھے۔ اس سلسلے میں چند باتوں کا ذکر مفید ہوگا۔

۱۔ آتابک ابوبکر بڑا دین دار بادشاہ تھا، شد الازار میں ہے:

"سلطانی عادل بود کہ دایماً با وضو و ذکر می بود و ہرگز شراب نخورد و بدرستی کہ خدای تعالیٰ درجہ او بلند گردانید و از انوار سعادت و کرامت چندان او را ارزانی داشت کہ بہ ہیچ یک از بادشاہان کہ در عہد او بودند نداد و مبانی سنت احمدی محکم میکرد و عہدہای ملت محمدی را بجای می آورد و در تربیت علما و بزرگ داشتن عابدان و تعظیم زاہدان و صالحان مبالغہ میکرد" (شد الازار ترجمہ ص ۲۶۶)

تاریخ وصاف (تحریر) سے اس بات کی تائید ہوتی ہے:

"آتابک بہ زہاد و متصوفہ اعتقادی راسخ داشت و ایشان را بر ائمہ و علماء و فضلاء برتری می داد، ازین رو گروہی در لباس زہاد نیز در وی رفتند و از انعام او محظوظ شدند و نیز در بارہ ابلہان و سادہ لوحان می فرمود اینان اولیاء و جلسار می خدا یند و نفوس ملکی دارند و از حیلہ و نیرنگ خالی اند و در عوض از خداوند ہوش و خرد اہل نطق و فضیلت خائف بود" (ص ۹۳)

کہتے ہیں کہ ایک روز ایک جاہل مشائخ کے لباس میں اس کی بارگاہ میں آیا، آتابک نے اس کی بڑی تعظیم و تکریم کی، جب نماز مغرب کا وقت آیا تو اس کو امامت کے لئے کہا گیا، وہ مخارج حروف سے نابلد تھا، اھدنا الصراط المستقیم کو غلط ادا کیا، اس غلط خوانی سے اس کے بارے میں آتابک کا اعتقاد راسخ تر ہو گیا اور اس کو بہت صلہ و انعام دے کر رخصت کیا۔ (ایضاً ص ۹۴)

آتابک ابوبکر ان فضلاء سے جو حکمت و فلسفہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے، نفرت کرتا،

چنانچہ ایسے فضلاء کی ایک جماعت کو شیراز سے نکال دیا، ایسے نکالے ہوئے لوگوں میں وصاف نے تین فضلاء کا نام لکھا ہے:

(ا) صدرالدین[1] محمود اشنہی (ب) شہاب الدین[2] تودہ پشتی (ج) اعزالدین ابراہیم قیسی

عمیدالدین اسعد ابزری کی سزا اور پھانسی کا حکم شاید آتابک کی اسی مذہبی سختی اور تنگ نظری کا نتیجہ ہو۔

---

[1] صدرالدین محمود اشنہی کا تعلق اشنہ سے تھا، آذربائیجان میں ارومیہ کے جوار میں ہے، یہ شہر اشنو و اشنویہ بھی کہلاتا ہے اردبیل سے پانچ فرسخ کی دوری پر ہے اور ارومیہ سے دو روز کی مسافت پر ہے، مختلف علوم کا ماہر تھا، علوم اصول و فروع و الٰہیات، طبیعیات، ہندسہ، ہیئات حساب، جدلیات، طب، تاویل و تفسیر و احادیث و ادبیات میں بڑا کمال کا درجہ رکھتا، واعظ بھی تھا، کہتے ہیں عرفات میں حج کے موقع پر وعظ کہتا تھا، ایک مجلس میں شیخ شہاب الدین سہروردی بھی تشریف لائے، انہوں نے صدرالدین اشنہی کی بڑی تعریف کی، اتابک ابوبکر نے شیراز سے نکال دیا تو یہ اشعار نظم کئے: از صحبت تو کنون فراق اولی تر بر درگہ تو زرق و نفاق اولی تر

چوں پردۂ راستی مخالف کردی مارا پس ازین راہ عراق اولی تر

ان کے والد تاج الدین اشنہی بھی بڑے فاضل تھے، بیٹے کی طرح وہ مختلف علوم میں کمال کے درجے پر فائز تھے، ان کی ایک کتاب غایۃ الامکان فی درایۃ المکان ہے، یہ کافی مقبول کتاب تھی، ان کے شاگردوں میں امام الدین داؤد بن محمد بن روزبہان الفرید تھے، تحفۃ العرفان فی ذکر سید الاقطاب روزبہان میں ان کا تذکرہ ہے اور ان کی نسبت کی ایک حکایت صدرالدین اشنہی کی روایت سے تحفۃ العرفان میں درج ہے، باپ اور بیٹے دونوں شاعر تھے، ان دونوں کے کافی اشعار شیخ اسماعیل بن عبدالمومن اصفہانی نے ترجمہ عوارف میں نقل کئے ہیں (بقیہ حاشیہ ص ۲۶۷ پر)

۲۔ مذکور ہو چکا ہے کہ اتابک سعد بن زنگی نے اپنے بیٹے اتابک ابوبکر کو قید کر دیا تھا، وہ سات سال تک قید رہا، سعد کی وفات پر ۶۲۳ھ میں وہ قید سے نکالا گیا اور تخت نشین کرایا گیا، قید کی حالت میں ۶۲۲ھ میں اس نے عزالدین زرکوب[1] شیرازی کی خدمت میں ایک خط التماس دعا کے لئے لکھا، وہ خط اور دعا شیراز نامہ ص ۸۲-۸۳ میں درج ہے، اتابک ابوبکر لکھتا ہے:

---

[1] عزالدین مودود بن محمد بن معین الدین محمود المشتہر بہ زرکوب شیرازی (ولادت ۵۶۲ وفات ۶۶۳) کے حالات کے لئے دیکھئے شیراز نامہ ص ۱۶۱-۱۶۳، و شدالازار ص ۳۱۰ بعد عزالدین مودود شیرازی صاحب شیراز نامہ کے دادا تھے (شیراز نامہ ص ۱۲۹)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۶ کا) راقم الحروف یہ سارے اشعار اپنے مجموعہ مقالات طبع تہران ۱۳۷۰ھ بعنوان قند پارسی میں جمع کر دئے ہیں (ص ۳۵۶ تا ۳۶۰) ایسا قیاس ہوتا ہے کہ ترجمہ عوارف کے موقع پر یہ دونوں فاضل فوت ہو چکے تھے، یہ ترجمہ ۶۶۵ میں مکمل ہوا تھا، اس لئے تاج الدین اور صدرالدین دونوں کی تاریخ وفات اس سنہ سے پہلے کی ہوگی۔ ان عارفوں کی زندگی کے منابع یہ ہیں:

تاریخ وصاف، شیراز نامہ، شدالازار، تحفۃ عرفان، مجمل فصیحی، ترجمہ عوارف از شیخ اسمٰعیل بن عبدالمومن بن ابی منصور اصفہانی، قند پارسی۔

[2] امام شہاب الدین تودہ پشتی کی نسبت میں اختلاف ملتا ہے، شیراز نامہ میں تاریخ وصاف کی روایت ہو بہو درج ہے، سوائے اس کے کہ شہاب الدین کی نسبت تودہ پشتی ہے (ص ۸۳) جب کہ شدالازار ص ۱۹۰ میں تورپشتی ہے، علامہ قزوینی کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یزد سے ۲۵ کیلو اتر جنوب میں ابھی تک ایک قریہ توروں پشت نام کا موجود ہے (شدالازار ص ۱۹۰-۱۹۱ حاشیہ) شہاب الدین فضل اللہ تورپشتی یا توران پشتی شافعی فقہ اور محدث تھا، صاحب مجمل فصیحی کے بقول وہ ساکن شیراز تھا، قتلغ (بقیہ حاشیہ ص ۲۶۸ پر)

"جناب شیخ الشیوخ عز الدین مودود زرکوب شیرازی کی خدمت میں ہزاروں درود واز سر اخلاص و اعتقاد پیش کر کے ان کی توجہ چاہتا ہے اور آرزو مند ہے کہ کوئی دعائے ماثورہ جو اہل اللہ کے عمل میں ہو، اس کو میرے پاس کسی درویش کے ذریعے بھیج دیں اور شیخ الشیوخ نجیب الدین محمد یزدی سے میرے لئے دعا کی درخواست کریں"۔

شیخ مذکور نے جوابی خط لکھا اور دعا بھی لکھ بھیجی، ملاحظہ ہو:

"بسم اللہ و باللہ ہو المعز بعزیزہ باسعادہ: مزید استظہاری کہ آن شاہ شاہزادہ را بہ دعوات و ہمت درویشان گوشہ نشین است ہمچون ایام دولت ہموارہ در تضاعف و ترقی باد برادر اعز محبوب قلوب الصدیقین شیخ نجیب الدین محمد یزدی دام توفیقہ کہ دعا و ہمت او بجای تریاک اکبر است نقل فرمودہ از مقتدائے سلک عہد اوحد الدین کرمانی کہ حق تعالیٰ بہ خواب دیدم و این دعا تعلیم من فرمود آن دعا می رسد و بدان مواظبت فرماید کہ این مقدار از حضرتش با کفایت باشد"۔

نسخۂ دعا

اللّٰهم سكن هيبة صدمة قهرمان الجبروت باللطيفة التامة

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۷)

ترکان خاتون فرمانروائے کرمان (۶۵۵-۶۸۱ھ) کی استدعا پر کرمان گیا اور وہیں سکونت اختیار کی اور وہیں ۶۶۱ھ میں وفات پائی، لیکن کسی کتاب میں سوائے تاریخ وصاف اور شیراز نامے کے شیراز سے شہر بدر کئے جانے کا ذکر نہیں، علامہ قزوینی کی تحقیق کے مطابق (تورون پشت، توران پشت شیرکوہ کے دامن میں واقع ہے، اس کے کنارے سنگ مرمر کا کان ہے اور وہاں کے رہنے والے اکثر سنگ تراش ہیں، تمدالانا (ص ۵۰۳) سے معلوم ہوا کہ شیخ شہاب الدین فضل اللہ تورپشتی اصل الدین عبد اللہ بن علی بن ابی المحاسن (مسخ شمارہ ۳۲۹) کے مشائخ میں تھے۔

النازلة الواردة من فيضان الملكوت حتى نتشبث باذيال لطفك ونعتصم بك من انزال قهرك يا ذا القوة الكاملة فسبحان الذى بيده ملكوت كل شئى واليه ترجعون، و در شبانروزی ہزار بار این کلمہ بگوید: "یا لطیف ادرکنا بلطفک الخفی" کہ بیشک مقصود بحصول پیوندد، ان شاء اللہ تعالیٰ وحدہ العزیز وهذه اضراعة الفقير الى الله تعالى

ابو محمد بن مودود زرکوب الشیرازی

اس دعا کی تاثیر دیکھئے کہ ۶۲۲ھ میں یہ دعا آتابک ابوبکر بن سعد کے پاس قید خانے میں بھیجی گئی اور ایک سال کے اندر ہی ۶۲۳ھ میں وہ قید سے نکل کر وارث سلطنت ہوا۔

تفصیلات بالا سے واضح ہے کہ عمید الدین اسعد ابزری بڑی شخصیت کا مالک تھا، آتابک سعد بن زنگی کے زمانے میں سارے امور اسی کے فیصلے سے سر انجام پاتے تھے، اس کے ساتھ بڑا فاضل تھا، عربی و فارسی کا صاحب دیوان شاعر تھا، نثر اور نظم دونوں میں ماہرانہ قدرت رکھتا تھا اس نے جو قصیدہ حبس میں انتہائی پریشانی کی حالت میں لکھا تھا، وہ اس کے قتل کے بعد ہی سارے آفاق میں مشتہر ہو چکا تھا، اس کے باوجود سعدی شیرازی کے یہاں اس نابغۂ روزگار کا نام تک نہیں ملتا، شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ سعدی شیرازی آتابک ابوبکر سے منسلک تھے، جیسا کہ ان کے کلام سے واضح ہے اور آتابک ابوبکر عمید الدین اسعد کا سخت دشمن تھا، یہاں تک کہ اپنی حکومت کی ابتدا ہی میں اس کو محبوس کر دیا اور چند ماہ کے اندر اس کو پھانسی پر لٹکا دیا، شاید یہی وجہ ہو کہ سعدی کا کلام عمید الدین کے ذکر سے خالی ہے۔

البتہ بعض شاعروں نے اس کی مدح کی ہے، ان شاعروں کے مدحیہ کلام سے ظاہر

ہوتا ہے کہ عمیدالدین اپنے زمانہ اقتدار میں شاعروں اور فاضلوں کا قدردان تھا، علامہ قزوینی نے دو[2] شاعروں کو عمید کا مداح بتایا ہے، ایک رفیع الدین لبنانی، دوسرا کمال الدین اصفہانی، ذبیح اللہ صفا نے رفیع لبنانی کے معاصرین میں تین[3] شعرا کا نام لکھا ہے یعنی جمال الدین اصفہانی، شرف شفرویہ اور کمال الدین اصفہانی، جمال الدین کے دیوان میں عمیدالدین ابزری کا ذکر نہیں پایا جاتا، شرف شفرویہ کا دیوان میرے دسترس میں نہیں البتہ کمال الدین کے یہاں عمیدالدین کے مدحیہ کلام موجود ہے، لیکن اگر عمید کے دوسرے اور معاصر شاعروں کے کلام کا دقت نظری سے مطالعہ کیا جائے تو عمید کا ذکر کسی نہ کسی شاعر کے یہاں مل جائے گا۔

کمال الدین اصفہانی کے دیوان میں کم از کم تین[3] نظمیں عمید کی مدح میں ہیں، دو[2] قصیدے ہیں اور ایک قطعہ پہلا قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے:

بدیدمت نہ سرآن معاملت داری   کہ دست باز کشی یکدم از ستمکاری (دیوان طبع حسین بحر العلومی ص ۳۴۹)

دوسرے کا مطلع یہ ہے:

فراق روی تو ما را بروی آن آورد   کہ در چمن بسر لالہ مہرگان آورد (ایضاً ص ۳۴۳)

قطعہ کا مطلع یہ ہے:

ای قاصر از ستایشی تو ہر عبارتی   آصف نکرد چون تو بر ونق وزارتی (ایضاً ص ۴۴۷)

کہتے ہیں عمیدالدین جب اصفہان آیا تھا تو کمال نے قصیدہ لکھا، چند بیت ملاحظہ کریں:

حقیقت آصف ثانی کہ با دہیبت او   زبود از سر گردون کلاہ جباری

حیات بخش افاضل عمید ملت و دین   کہ نیست کنہ معانی او زبسیاری

ہوا و خاک صفاہان زمین مقدم تو   نشستہ اند بہ کحالی و بہ عطاری

مرا اگرچہ گرانم بخر کہ ہر مایہ   ہمہ متاع گران را کند خریداری

اگرچہ پیروی من باضطرار کند   گر این قصیدہ بخواند روان مختاری

سخن بہ پایہ قدر تو کی رسد کہ تو خود   زروی مرتبت افزون ز حد مقداری

دوسرے قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں:

فراق روی تو ما را بروی آن آورد   کہ در چمن بسر لالہ مہرگان آورد

ز وصل یار مرا صد ہزار را خوشتر   حدیث آنکہ زناگاہ مژدگان آورد

کہ پادشاہ وزیران لطائع مسعود   خجستہ روی بدین دولت آشیان آورد

عمید دولت و ملت کہ دست مسند حکم   چو پای ہمت بر فرق فرقدان آورد

گمان مبر کہ زمانہ ز مستقر جلال   ترا بخیرہ بدین تیرہ خاکدان آورد

ولیک جاذبہ ہمت مسلمانان   عنان گرفتہ ترا سوی اصفہان آورد

قطعہ کے ضمن کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

در اصفہان بدولت عدل تو می کنند   در ہر محلتی کہن از تو عمارتی

اینست دبس مراد دل و جان ہمگنان   کارد کسی موکب میمون بشارتی

عمیدالدین ابونصر فارسی ابزری کے بارے میں جو باتیں اوپر درج ہوئی ہیں، ان سے اس کی فضیلت کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے، وہ اپنے دور کی اہم شخصیت تھی، وہ اچھا خاصہ شاعر تھا، اس کے دیوان ناپید ہیں، لیکن قصیدہ اشکنوانیہ موجود ہے، اس کی مفصل شرح بھی دستیاب ہے، ان سے یہ بات واضح ہے کہ یہ تحقیق کا دلچسپ موضوع ہے۔ لیکن جیسے سینکڑوں ہزاروں موضوعات فضلا کی کوتاہ قلمی کی وجہ سے پردۂ خفا میں جا پڑے ہیں، یہ موضوع بھی اچھوتا ہی رہ گیا۔ اگر کوئی فاضل اس موضوع کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے تو یہ اچھا اقدام ہوگا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مطالعہ وخدمتِ قرآن کی سرگزشت

از
ضیاء الدین اصلاحی

"یہ مضمون شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے مولانا پر ۲۳،۲۴ فروری ۲۰۰۰ء کو ہونے والے سمینار میں پڑھا گیا، اسی وقت پروفیسر مختار الدین احمد، مولانا حبیب ریحان خاں ندوی اور متعدد اصحاب علم نے اصرار کیا تھا کہ اسے جلد از جلد معارف میں شایع کر دیا جائے"۔ (ض)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زندگی کے تین۳ دور تھے۔ پہلا دور ان کی طالب علمی اور حصول علم کا تھا۔ دوسرا دور دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم وتدریس کا تھا۔ تیسرا دور ندوۃ العلماء کی تعلیمی وانتظامی نگرانی، ملک وبیرونِ ملک میں اصلاحی، دعوتی اور تبلیغی اسفار ومحاضرات، تصنیف وتالیف کی مشغولیت اور گوناگوں علمی، تعلیمی، دینی، دعوتی، قومی، ملی اور اجتماعی سرگرمیوں کا تھا، جس کا سلسلہ ہندوستان اور عالم اسلام ہی نہیں یورپ، امریکہ اور افریقہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس مضمون میں ان کے مطالعہ کی سرگزشت اور روداد پیش کی جاتی ہے۔

پہلا دور اور مولانا کی قرآن مجید کی تعلیم | مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی عربی تعلیم کا

آغاز ۱۹۲۴ء کے آخر میں ہوا، اس زمانے میں شیخ خلیل بن محمد بن شیخ حسین بن محسن انصاری یمنی بھوپالی جو عرب صاحب کے نام سے مشہور تھے، لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے، ان کا گھر اور مولانا کا گھر محلہ جھاؤلال میں جواب محمد علی لین کہلاتا ہے، پاس پاس تھا۔ یونیورسٹی جانے سے پہلے اور بعد میں عرب صاحب کے گھر پر ان کا مدرسہ چلتا تھا، ۱۹۲۶ء میں بارہ۱۲ تیرہ۱۳ برس کی عمر میں انہوں نے مولانا علی میاں کو ان کے بڑے بھائی اور مربی ڈاکٹر سید عبد العلی سابق ناظم ندوۃ العلماء کے کہنے سے اپنے گھر کے مدرسہ میں عربی پڑھانا شروع کیا۔ مولانا نے ان سے ان کے خاص نصاب کی متعدد کتابیں پڑھیں، اسی سلسلے میں قرآن مجید کا وہ حصہ بھی پڑھا جس کا مرکزی مضمون توحید ہے[1]، مولانا کو اعتراف تھا کہ عرب صاحب نے ہمیشہ کے لئے دل پر توحید کا نقش قائم کر دینے کے لئے سورۂ زمر بڑی توجہ اور ذوق وشوق سے پڑھایا، توحید ان کا ذوقی مضمون تھا، دل کھول کر پڑھایا اور دل کو توحید کے لئے کھول دیا، لکھتے ہیں:

"وہ دن ہے اور آج کا دن، اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ

اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ۔ (زمر: ۳) — یاد رکھو کہ اطاعت خالص کا سزاوار اللہ ہی ہے۔

کا نقش قائم ہے اور اس کے سامنے:

مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی۔ (زمر: ۳) — ہم اپنے معبودوں کی عبادت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا سے قریب تر کر دیں۔

کا حیلہ اور دعویٰ جو ہمیشہ سے نظام شرک کا سب سے بڑا فلسفہ ہے تارِ عنکبوت معلوم ہوتا ہے[2]"۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے دو نامور تلامذہ سے استفادہ

برصغیر کے ممتاز عالم مولانا عبید اللہ سندھی کی دلچسپی اور توجہ کا خاص مرکز قرآن مجید تھا اور وہ افکار و علوم ولی اللّٰہی کے سب سے بڑے عاشق و شیدائی اور عارف و شارح تھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خیال میں ماحول اور مخصوص حالات کے اثر نے ان کے ذہن کو جہاد و حریت، احیائے خلافت و حکومت الٰہی، حصول آزادی اور انگریز دشمنی کی طرف ایسا موڑ دیا تھا کہ ان کو سارا قرآن مجید اسی کی تفسیر اور اسی کی دعوت و تبلیغ معلوم ہوتا تھا، ان کی ذہانت و نکتہ آفرینی نے اس کی آیات و اشارات سے وہ کام لیا کہ ان کو اپنے ہر دعوی کی تائید قرآن مجید ہی میں نظر آتی تھی اور انہوں نے اس سے اجتماعی و سیاسی زندگی کے ایسے ایسے اصول و کلیات اخذ کیے جن کا نہ کسی قدیم تفسیر میں نشان ملتا ہے نہ کسی جدید تفسیر میں۔ یہ طرز استنباط اور یہ طریقہ تفسیر صوفیائے کرام کے تفسیری لطائف اور متصوفانہ نکات سے بہت ملتا جلتا تھا جن کو وہ الاعتبار و التاویل کے نام سے موسوم کرتے تھے اور جن کے نمونے شیخ اکبر کی فتوحات مکیہ، علامہ مہائمی کی تفسیر تبصیر الرحمن و تیسیر المنان اور علامہ حقی کی تفسیر روح البیان میں دیکھے جاسکتے ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں "اگر اس کو تفسیر کا نام دیا جائے اور الاعتبار و التاویل ہی کے نام سے یاد کیا جائے نیز وہ حد اعتدال سے متجاوز نہ ہو تو ہر دور کے علماء نے اس میں حرج نہیں سمجھا ہے"۔[۱۲]

مولانا عبید اللہ سندھی جس خاص طرز تفسیر کے بانی تھے اس میں اس برصغیر میں ان کے دو مایہ ناز شاگرد تھے جو ان کے طرز تعلیم اور مسلک تفسیر کے حامل و امین اور اس میں ان کے سچے جانشین تھے۔ ایک خواجہ عبدالحی فاروقی اور دوسرے مولانا احمد علی لاہوری امیر انجمن خدام الدین۔ اول الذکر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تفسیر و دینیات کے استاد تھے ان کے

درس سے کم لیکن ان کی تفسیری تصانیف سے مولانا سندھی کے طرز کا تعارف علمی حلقہ میں زیادہ ہوا اور موخر الذکر کے درس سے اس کا چرچا ملک کے گوشہ گوشہ میں ہوا، یہ اتفاق ہے کہ مولانا علی میاں نے ان دونوں سے قرآن کا درس لیا۔

خواجہ عبدالحی صاحب دارالعلوم دیوبند میں مولانا کے بزرگ اور شفیق بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے ہم سبق تھے، ان کی دعوت پر خواجہ صاحب ۱۹۲۷ء میں ایک مرتبہ گرمی کی تعطیل میں لکھنؤ آئے اور ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر قیام فرمایا تو ان کی فرمائش پر خواجہ صاحب نے مولانا علی میاں کو آخیر پارے کی آخیر کی کچھ سورتیں پڑھائیں، اس وقت مولانا کی عمر ۱۳ یا ۱۴ برس تھی۔[۱۳]

دوسرے بزرگ مولانا احمد علی صاحب سے وہ ۱۹۲۹ء میں شرف ملاقات حاصل کرچکے تھے، اگلے سال ۱۹۳۰ء میں ان سے خاص استفادے کے لیے گرمیوں کی تعطیل میں لاہور تشریف لے گئے تو معلوم ہوا کہ علماء کلاس یعنی عربی مدارس کے طلبہ و فضلاء کا باقاعدہ درس رمضان، شوال اور ذی قعدہ میں ہوا کرتا ہے، اس وقت تو صرف فجر کے بعد عمومی درس میں اہل شہر شریک ہوتے ہیں اور مغرب کے بعد انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کا کلاس ہوتا ہے، تاہم ازراہ شفقت مولانا علی میاں کو انہوں نے خصوصی وقت دیا اور شروع سے قرآن پڑھانا شروع کیا، لیکن اس درس کا سلسلہ زیادہ دن نہیں رہا، سورۂ بقرہ کا ابتدائی نصف حصہ ہوا ہوگا کہ لکھنؤ واپسی ہوگئی، ۱۹۳۱ء میں حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیا اور ۱۹۳۲ء میں علماء کلاس میں شریک ہوئے اور پورا قرآن مجید پڑھا۔ مولانا علی میاں کا بیان ہے کہ فجر کے بعد ذرا دن چڑھے سبق شروع ہوجاتا اور کئی کئی گھنٹے جاری رہتا، مولانا سندھی نے ہر رکوع کا خلاصہ چند جملوں میں کر رکھا تھا، اس کو اور اس کے ماخذ کو یاد کرنا پڑتا تھا اور

خیا درس شروع ہونے سے پہلے پچھلے درس کا امتحان ہوتا تھا، مولانا علی میاں کے بیان کے بہ موجب ان کا حافظہ کمزور تھا، اس لئے ان کو بڑی محنت کرنی پڑتی تھی؎ مولانا علی میاں نے مولانا احمد علی کے درس کے تین اہم اور مرکزی نکتوں کی نشان دہی کی ہے۔

۱۔ عقیدۂ توحید کی وضاحت اور شرک کا رد و ابطال۔ مولانا ابوالحسن علی فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ میرے خاندانی مسلک کی ترجمانی اور تائید تھی اس لئے میرے دل نے اس کا خوب ذائقہ لیا اور دماغ نے اس کو پورے طور پر قبول کیا۔

۲۔ اہل اللہ کے موثر اور دل آویز واقعات بالخصوص اپنے سلسلہ کے مشائخ کا دل نشین و دل پذیر تذکرہ۔

۳۔ جذبۂ جہاد، بغض فی اللہ اور انگریزوں سے دشمنی اور شدید نفرت؎

مولانا علی میاں نے مولانا احمد علی کے درس کا اصل مقصد قرآن مجید کے علم و فہم میں بصیرت پیدا کرنا بتایا ہے جس کے سلسلے میں وہ اپنے محبوب استاذ مولانا عبیداللہ سندھی کے متبع اور پیرو تھے اور وہ اسے تفسیر کے بجائے الاعتبار والتاویل کا نام دیتے تھے۔

مولانا علی میاں کو اس طرز سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں ہوئی اور انہوں نے اپنے درس میں اس کی مکمل پیروی بھی نہیں کی، تاہم ان کو اس سے فائدہ بہت ہوا اور ان کے مطالعہ قرآن میں اس مجلس درس کا فیض ہمیشہ شامل رہا اور اس کی برکت انہوں نے اپنی بعد کی علمی و تبلیغی زندگی میں محسوس کی، وہ مولانا کی صحبت، زاہدانہ و مجاہدانہ زندگی، اخلاص، قرآن مجید سے والہانہ تعلق اور اس کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کے بے قرارانہ جذبہ وغیرہ کے ہمیشہ بڑے مداح و معترف رہے؎

مشکلات قرآن میں مولانا حسین احمد مدنی سے رہنمائی کی طلب

مولانا سید

حسین احمد مدنی مولانا علی میاں کے برادر معظم و مربی ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم کے پیر و مرشد تھے، وہ لکھنؤ تشریف لاتے تو ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر فروکش ہوتے، ۱۹۳۲ء کی کسی تشریف آوری کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے برادر خورد کو ان کی خدمت میں تربیت و اصلاح اور تحصیل حدیث کے لئے پیش کیا، یہ اس پروگرام کے مطابق جولائی، اگست ۱۹۳۲ء میں دیوبند تشریف لے گئے اور مولانا کے بخاری و ترمذی کے درس میں شریک ہوئے، مولانا علی میاں کو اس زمانے میں قرآن مجید کی تفسیر کے مطالعہ کا شوق تھا، اس میں جو اشکالات پیش آتے تھے وہ بعض مرتبہ کسی کتاب سے حل نہیں ہوتے تھے، اس بنا پر انہوں نے مولانا سے درخواست کر کے قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کے سمجھنے کے لئے خصوصی وقت مانگا، مولانا نے جمعہ بعد کا وقت مرحمت فرمایا، مگر مولانا کے سیاسی دوروں کی وجہ سے اکثر ناغے ہو جاتے، چنانچہ مولانا علی میاں کے حصہ میں بہت کم جمعے آئے، تاہم وہ محروم نہیں رہے، استفادے کا موقع ملا اور ان کو مولانا مدنی کے تدبر فی القرآن کا اندازہ ہوا؎

دوسرا دور دار العلوم ندوۃ العلماء میں معلم و استاد تفسیر و ادب کی حیثیت سے

مولانا علی میاں نے ۲۰ برس کے سن میں باضابطہ و منظم حصول تعلیم کی مدت ختم کر لی تو یکم اگست ۱۹۳۴ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر و ادب کے استاد مقرر کئے گئے، وہ متوسط اور بعض اونچے درجے کی کتابیں اور درجہ ششم کو قرآن مجید کے ابتدائی دس پارے پڑھانے کے لئے ملے، یہ حصہ بکثرت آیات احکام اور فقہی و کلامی مباحث پر مشتمل تھا اور پڑھنے والوں میں متعدد طلبہ ذہین و ذی استعداد تھے اور ان کی اکثریت مولانا سے عمر میں یا تو بڑی یا قریب قریب ہم عمر تھی، مولانا سے پہلے یہ حصہ ایک فاضل و کہنہ مشق استاذ مولانا عبدالرحمن کاشغری ندوی پڑھاتے تھے اس لئے مولانا کو محنت و مطالعہ اور اس اہم

درس کا اہل ثابت کرنے کی ضرورت تھی، اس لئے تفسیر کی قدیم بڑی کتابیں اور اہم بنیادی ماخذ ان کے سامنے رہتے تھے اور بعض تفسیریں مثلاً کشاف، معالم التنزیل بغوی و مدارک تقریباً لفظاً لفظاً پڑھیں، جدید تفاسیر میں سے تفسیر المنار اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن سے پورا استفادہ کیا، ان کے خیال میں تدریس اور طلبہ کے سوالات کے جواب میں علامہ آلوسی کی روح المعانی سے سب سے زیادہ مدد ملی۔ جدید معلومات اور تقابلی مطالعہ کے سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریابادی سے خط و کتابت شروع کی اور ان سوالات کے حل میں ان سے مدد لی، کئی بار ان سے استفادے کے لئے دریاباد بھی گئے، اس طرح سال ختم ہونے سے پہلے طلبہ کو پورے طور پر مطمئن کرنے پر قادر ہوگئے۔[10]

تعلیم و تدریس کے زمانے میں مولانا کو متعدد کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا، خاص قرآن مجید سے متعلق جو کتابیں ان کے مطالعہ میں آئیں اور جن سے ان کو زیادہ فیض پہنچا وہ یہ ہیں:

۱۔ قیام اللیل : یہ محمد بن نصر مروزی کی تصنیف ہے، جس میں شب بیدار نوجوانوں کے موثر واقعات اور قیام لیل کے فضائل جمع کئے ہیں، اسی ضمن میں قرآن مجید کی بعض آیات کی نہایت پُراثر تفسیر کی گئی ہے۔[11]

۲و۳۔ تفسیر سورۂ نور و تفسیر سورۂ اخلاص : امام ابن تیمیہؒ کے ان تفسیری رسائل نے بھی ان کی دستگیری کی اور ان سے ان کو مدد ملی۔[12]

۴۔ ازالۃ الخفاء : شاہ ولی اللہ دہلوی کی اس کتاب کی گوناگوں خصوصیات میں ایک خصوصیت مولانا نے آیات کی تفسیر و تطبیق بتائی ہے، یہ ان کی پسندیدہ کتابوں میں تھی۔[13]

۵۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر : شاہ ولی اللہ صاحب کی اس مختصر تصنیف

کے بعض علمی اشاروں اور مختصر نکتوں نے قرآن مجید کے مطالعہ و تفسیر میں ان کی بڑی رہنمائی کی اور اس کے بعض مختصر جملوں اور تھوڑے لفظوں سے پورے پورے مضامین کے راستے اور مطالعہ قرآن میں ان کے ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئیں۔[14]

۶۔ ترجمان القرآن : مولانا آزاد کی اس تفسیر کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کی دوسری جلد سے تفسیر و فہم قرآن کے بعض نئے گوشے ان کے سامنے آئے اور ان کی فکر میں وسعت پیدا ہوئی۔[15]

زمانۂ تدریس میں ان کو اپنے مندرجۂ ذیل دو بزرگوں سے بھی رہنمائی ملی اور وہ ان کی قرآن فہمی سے بہت متاثر ہوئے۔

۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی : مولانا سید سلیمان ندوی کو درس و تدریس سے ہمیشہ بڑی مناسبت اور خاص شغف رہا، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جس کے معتمد تعلیم تھے تشریف لے جاتے تو طلبہ کے کلاس میں جا کر ان کو پڑھاتے بھی تھے۔

دارالمصنفین میں اپنے رفقاء کو بھی قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیتے جن میں اس زمانے کے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نوجوان فضلاء و اساتذہ مولانا مسعود عالم ندوی مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی اور مولانا محمد اویس نگرامی اکثر تعطیلات کے زمانے میں شریک ہوتے۔ ۱۹۳۵ء میں حضرت سید صاحب سخت علیل ہو گئے تھے، جب افاقہ ہوا اور ملاقات کی اجازت ہوئی تو دارالعلوم ندوہ کے استادوں کے وفد کے ساتھ مولانا علی میاں بھی عیادت اور مبارک باد کے لئے اعظم گڈھ تشریف لائے، ان کے قیام کے زمانے میں سید صاحب کے علمی مذاکرات شروع ہوگئے اور ان کا قدیم علمی و تدریسی ذوق اُبھر گیا، مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں:

"ایک روز مجلس میں سورۂ جمعہ پر اور اس کی آیات کے باہمی ربط اور نظام پر ایسی فاضلانہ تقریر فرمائی اور ایسے علمی نکتے بیان کئے کہ ہم لوگ یہ سمجھے کہ سید صاحب کا اصل موضوع تفسیر اور تدبر قرآن ہی ہے، اس تقریر کو قلم بند نہ کرنے کا اب تک افسوس ہے۔"[16]

عموماً لوگ سید صاحب کو مورخ یا ادیب سمجھتے ہیں خصوصاً علماء کے قدیم حلقہ میں ان کا تعارف اسی سلسلہ سے ہے، لیکن مولانا علی میاں کو ان کی علمی صحبتوں اور ذاتی استفادے سے معلوم ہوا:

"ان کا امتیازی مضمون قرآن مجید اور علم کلام ہے، میں نے معاصر علماء میں کسی شخص کا مطالعہ قرآن مجید اور علوم قرآن کا اتنا وسیع اور گہرا نہیں پایا، علم کلام اور عقائد پر سید صاحب کی نظر بہت وسیع و عمیق تھی اور ان کو علم کلام کو سلف کے اصول اور کتاب و سنت کی روشنی میں عصر حاضر کے ذہن اور روح کے مطابق پیش کرنے کا خاص ملکہ تھا اور یہ غالباً مولانا حمید الدین فراہیؒ کی طویل صحبت، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کی کتابوں کے مطالعہ اور سیرت النبی کی تالیف کے سلسلے میں طویل غور و فکر کا نتیجہ تھا۔"[17]

مولانا مناظر احسن گیلانی: دوسرے بزرگ مولانا مناظر احسن گیلانی بھی مولانا فراہی کے فیض یافتہ تھے، جب مولانا علی میاں نے تفسیر کا تفصیلی مطالعہ شروع کیا تو ان کے بھائی اور مربی کو خیال ہوا کہ انھیں مولانا گیلانی کے پاس حیدر آباد بھیج دیں، مولانا گیلانی کو بھی اس اطلاع سے خوشی ہوئی مگر مولانا علی میاں کسی مانع کی وجہ سے ان کی خدمت میں نہیں پہنچ سکے تاہم خط و کتابت اور ملاقات و تبادلہ خیال سے قرآنی مشکلات میں ان سے برابر رجوع فرماتے تھے، ایک دفعہ پروفیسر اجمل خاں کا ایک مضمون مدینہ بجنور میں شایع ہوا جس میں

قرآن مجید کی جمع و ترتیب کے متعلق ایسے مشککانہ خیالات ظاہر کئے گئے تھے جس سے نہ صرف اس کی موجودہ جمع و ترتیب بلکہ اس کی محفوظیت مشتبہ ہو جاتی تھی۔ گو یہ مضمون عامیانہ خیالات اور سطحی باتوں کا مجموعہ تھا اور اس کی کوئی علمی و تحقیقی اہمیت نہیں تھی تاہم یہ ایک بڑے فتنے کا آغاز تھا، اس لئے مولانا گیلانی کے علم و حمیت میں اس سے حرکت و جنبش پیدا ہوئی اور انہوں نے نفس مسئلہ جمع و ترتیب قرآن پر ایک عالمانہ و محققانہ مضمون سہ روزہ مدینہ بجنور ہی میں لکھا، مولانا علی میاں کو زمانہ تدریس میں اس کی ضرورت پیش آئی تو اسے مولانا سے حاصل کرنا چاہا، اسی کا ذکر کرتے ہوئے وہ قرآن مجید میں مولانا کی فہم و معرفت اور نکتہ رسی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:[1]

"اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا نکتہ رس اور نکتہ آفریں ذہن عطا فرمایا تھا، قرآن مجید کی وہی آیات اور صحاح کی وہی احادیث اور تاریخ کے وہی بیانات جو ہم آپ بیسیوں بار پڑھ چکے ہیں، مولانا ان سے ایسے حقایق ثابت کر دیتے اور ان سے ایسے عجیب لیکن صحیح نتائج نکالتے کہ حیرت ہوتی، اس مضمون میں بھی یہی شان ہے، قرآن مجید کے من جانب اللہ محفوظ و مرتب ہونے کو اور عہد رسالت میں اس کے مرتب اور جمع ہو جانے کو انہوں نے قرآن مجید کے الفاظ و نصوص اور واقعات سے اس طرح ثابت کیا تھا کہ اس خیال کی بنیادیں بالکل منہدم ہو جاتی تھیں کہ قرآن مجید بہت تاخیر کے ساتھ جمع و مرتب ہوا اور اس کی ترتیب حضرت ابوبکر اور حضرت زید کے اجتہاد کا نتیجہ ہے۔"[18]

---

[1] یہاں اس کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی طرح مولانا گیلانی کو بھی ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی سے استفادے کا موقع ملا تھا اور وہ اپنی تحریروں میں مولانا فراہی کو "استاد محترم" لکھتے تھے۔ (ض)

مولانا علی میاں نے قرآن مجید اور اس کی تفسیروں کے مطالعہ کے اپنے اس مرحلے میں تفہیم قرآن کے دو طبعی طریقے بتائے ہیں، ان کے نزدیک قرآن مجید سے اپنا حصہ لینے میں ضروری علمی ولسانی واقفیت کے بعد دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں، ایک علوم نبوت ومزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والے اشخاص کی صحبت جن کی معاشرت وزندگی کان خلقہ القرآن کا پرتو ہو اور جنھوں نے انا القرآن الناطق (حضرت علیؓ کا مقولہ) کہنے والے کی قلبی وذوقی وراثت میں حصہ پایا ہو۔ کئی الفاظ جو لسان العرب اور مفردات غریب القرآن سے اور کئی آیات جو زمخشری کی ادبی تفسیر کشاف، امام رازی کی عقلی تفسیر مفاتیح الغیب اور ابن کثیر کی نقلی تفسیر سے حل نہیں ہوتیں وہاں باتوں میں حل ہو جاتی ہیں، الفاظ ومعانی میں نئی وسعت اور قوت نظر آتی ہے جو پہلے نظر سے اوجھل تھی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انبیا علیھم السلام جن راستوں پر چلے ہیں ان پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے، ان کی جو کیفیات بیان کی گئی ہیں ان کا احساس ہوتا ہے، قوموں نے اپنے پیغمبروں کو جو جواب دئے ہیں کان وہی آواز سنتے ہیں اور آنکھیں وہی منظر دیکھتی ہیں جو اشکالات اور تشبیہات علم کلام کی کتابوں نے اور کتابی مطالعہ نے فرضی طریقہ پر پیدا کر دے ہیں۔ وہ وہاں بے حقیقت ہو جاتے ہیں[19]۔

مولانا نے اسی ضمن میں ایک سماعی حقیقت یہ بیان کی ہے کہ جب قرآن مجید میں جی لگنے لگتا ہے تو انسانی تصنیفات سے جی گھبرانے لگتا ہے، انسانی کتابیں، انسانی تحریریں، انسانی تقریریں پست اور بے مغز معلوم ہونے لگتی ہیں، ادبا، حکما اور مفکرین کی باتیں طفلانہ اور عامیانہ نظر آتی ہیں جن میں کوئی گہرائی اور پختگی نہیں معلوم ہوتی، انسان کا علم اتھلا اور خالی معلوم ہونے لگتا ہے اور اس کا دیر تک پڑھنا ذوق اور روح پر بار ہوتا ہے۔

ہر وہ چیز جو علوم نبوت کے سرچشمہ سے نہ آئی ہو مشتبہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتا ہے، تسکین صرف وحی ونبوت کے راستے سے آئے ہوئے علم سے ہوتی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا تک پہنچا دیا اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید میں اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے۔[20]

اسی زمانے میں مولانا پر کلام اقبال کا بڑا غلبہ رہا، ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ذوق قرآن مجید کے اشتغال اور ذوق پر غالب آرہا ہے مگر توفیق الٰہی نے دستگیری کی اور تنبہ ہوا کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں[21]۔

مولانا کو اپنی تدریسی زندگی میں یہ احساس ہوا کہ طلبہ مطالعۂ قرآن اور اس سے استفادے کے مقدمات اور اصول ومبادی سے ناواقف رہنے کی بنا پر صحیح طور سے قرآن کے مطالب وتعلیمات، اس کے پیغام، اس کی روح اور اس کے اعجاز سے بیگانہ رہتے ہیں، اس لئے اوپر کے درجوں کے طلبہ کے لئے انھوں نے مضامین ومقاصد قرآن پر خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا تاکہ تدبر فی القرآن کے لئے معاون اور اس کی عظمت واعجاز کے سمجھنے میں مددگار ثابت ہو۔

۱۹۴۰ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کے حکم سے الندوہ ان کی نگرانی میں پھر جاری ہوا جس کی ادارت کا قرعۂ فال مولانا علی میاں اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کے نام نکلا تو یہ مضامین اس میں شایع ہوئے اور ۱۹۸۱ء میں ان کا مجموعہ چند اور مضامین کا اضافہ کر کے "مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی" کے نام سے شایع کیا، جس میں حسب ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱۔ قرآن کا تعارف خود قرآن کی زبان سے ۲۔ اعجاز القرآن ۳۔ قرآن مجید اور قدیم

آسمانی صحیفوں کا فرق ۴۔ صحف سابقہ کی تحریفات پر تنبیہ اور مذاہب سابقہ کے عقائد وفِرق کے باریک فرق ۵۔ قرآن مجید کی ایک اہم پیشین گوئی، غلبہ روم ۶۔ قرآن کی چند دوسری پیشین گوئیاں ۷۔ قرآن کا ایک معجزہ ہدایت وانقلاب ہے ۸۔ قرآن مجید اور قدیم انسانی صحیفے علم وتاریخ کی میزان میں ۹۔ قرآن مجید سے استفادہ کے شرائط وموئیدات اور موانع ۱۰۔ قرآن سے استفادہ کے موانع ۱۱۔ وہ صفات جو قرآن کے فہم واستفادہ کے لئے معاون ہیں ۱۲۔ تلاوت وتدبر قرآن کے چند واقعات اور نمونے ۱۳۔ ایک تجربہ ایک مشورہ[۲۲]

عمومی درس قرآن مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے مئی ۱۹۴۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے علٰحدگی کے بعد ادارۂ تعلیمات اسلام کی بنیاد ڈالی۔ ادارہ میں جمعہ کے دن مغرب بعد عمومی درس قرآن کا انتظام کیا گیا جس کی ذمہ داری مولانا ابوالحسن علی ندوی پر اس لئے عائد کی گئی کہ وہ کئی برس سے دارالعلوم ندوہ میں قرآن مجید کے درس وتدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ علاوہ ازیں وہ مولانا احمد علی لاہوری امیر انجمن خدام الدین کے درس سے بھی بہرہ اندوز ہو چکے تھے، مولانا علی میاں نے اپنے درس میں اپنے استاد کے درس کے اس اصلاحی ودعوتی طرز کو اختیار کیا جو وہ تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے دیتے تھے، مولانا علی میاں کے درس میں تعلیم یافتہ طبقہ اور اعلیٰ مسلمان عہدے داروں اور دینی ذوق رکھنے والوں کا ایسا رجوع ہوا کہ نیچے کا ہال ناکافی ہونے لگا تو چھت پر اس کا انتظام کیا گیا، یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء کے بعد تک جاری رہا اور اس کی مرجعیت بڑھتی رہی، ۱۹۵۱ء میں مولانا علی میاں مشرق وسطیٰ کے طویل دورہ سے واپس ہوئے تو اسی سال مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی استاد وناظم دینیات ہو کر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی تشریف لے گئے، اس وقت کچہری روڈ پر تبلیغی مرکز قائم ہو چکا تھا، وہیں یہ درس بھی منتقل ہو گیا اور حاضری میں مزید ترقی ہوئی یہاں تک

کہ مائک لگانے کا انتظام کیا گیا، یہ سلسلہ برسوں چلتا اور ترقی کرتا رہا مگر مولانا کے طویل بیرونی اسفار اور دارالعلوم میں قیام منتقل ہو جانے کے بعد اس کی ذمہ داری ان کے رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی کی طرف منتقل ہو گئی جو مدت مدید تک اس کو انجام دیتے رہے[۲۳]

تیسرا دور تیسرے دور میں مولانا کی زندگی بہت مشغول رہی، اس میں انھوں نے بہ کثرت دعوتی وتبلیغی سفر کئے، صبح کہیں تو شام کہیں اور ہر جگہ ان کے مواعظ وخطبات اور ارشادات وتقاریر کا سلسلہ جاری رہتا، اس زمانے میں وہ ہندوستان خصوصاً مسلمانان ہند اور عالم اسلام کے پُرآشوب حالات کی وجہ سے مسلسل فکرمند اور برابر خلش واضطراب اور تشویش اور بے چینی میں مبتلا رہتے مگر اس کے باوجود انہوں نے علم وادب سے اپنا اشتغال قائم رکھا اور تصنیف وتالیف کی سرگرمی میں کمی نہیں آنے دی۔

مولانا کی اکثر تصنیفات اور خطبات کا موضوع دینی واصلاحی ہوتا جن میں قرآن مجید کی آیتیں اور حدیثیں بہ کثرت پیش کی گئی ہیں جو ان کی قرآنی ودینی بصیرت کا ثبوت ہے، لیکن براہ راست قرآن مجید اور اس کی تفسیر پر ان کی کوئی تصنیف نہیں، صرف ایک کتاب الصراع بین الایمان والمادیۃ اس سے مستثنیٰ ہے، اس میں سورہ کہف کے غور ومطالعہ کے نتائج قلم بند کئے گئے ہیں، لیکن جیسا کہ انہوں نے خود تصریح کی ہے کہ یہ عام تفسیروں جیسی کوئی کتاب نہیں ہے[۲۴] تاہم اس سے اور بعض دوسری کتابوں سے ان کے مطالعہ وتفسیر کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

سورہ کہف کے مولانا کے مطالعہ کی روداد یہ ہے کہ

عام مسلمانوں کی طرح وہ بھی بچپن ہی سے حصول ثواب کے لئے ہر جمعہ کو سورۂ کہف کی تلاوت کرتے تھے، ان کی والدہ کی سخت تاکید تھی اس لئے کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا، جب

کتب احادیث پڑھنے کی سعادت میسر آئی تو ان سے بھی اس سورہ کی تلاوت اور اسے حفظ کرنے کی ترغیب ملی اور یہ بھی پتہ چلا کہ اس سے دجال کے فتنے سے آدمی محفوظ رہے گا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری دور کا سب سے بڑا فتنہ قرار دیا ہے، اس سے ان کے ذہن میں یہ سوالات ابھرے کہ آخر اس سورہ میں وہ کیا معانی و حقائق اور تنبیہات و زواجر پوشیدہ ہیں جو اس فتنۂ عظیم سے حفاظت کا باعث بنیں گے، سورہ کو بار بار پڑھنے اور متواتر غور و فکر سے یہ مجمل حقیقت ان پر روشن ہوئی کہ پورے قرآن کی یہ واحد سورہ ہے، جس میں اخیر زمانے کے اس فتنے کا سب سے زیادہ تذکرہ ہے جس کی سربراہی دجال کرے گا اور پھر اس زہر سے محفوظ رہنے کا تریاق بھی اسی میں سب سے زیادہ ہے، جو شخص اسے یاد کر کے اور بہ کثرت تلاوت کر کے اس کے معانی کا لذت شناس ہوگا وہ اس تباہ کن فتنہ سے محفوظ رہے گا، ان کے سامنے یہ پہلو بھی روشن ہوا کہ اس سورہ کے اشارات و توجیہات اور حکایات و تمثیلات سے ہر زمانے اور ہر مقام پر دجال کے وجود اور اس کی دعوت اور فتنے کے برگ و بار پائے جانے کا ثبوت ملتا ہے، مگر اس سورہ میں اس کی مدافعت و مقابلے کا سامان بھی مہیا کر دیا گیا ہے، اس میں وہ روح موجود ہے جو پوری قوت و صراحت کے ساتھ دجالیت کی نمائندگی کرنے والوں اور ان کے طرز فکر اور طریقۂ زندگی سے متعارض و متصادم ہے[25]۔

اس کے مضامین و مطالب میں گھسنے سے ان کو یہ سورہ بالکل نئی اور تازہ معلوم ہونے لگی اور انہیں یہ پتہ چلا کہ اس کا ایک ہی موضوع ہے ایمان و مادیت یا اس عالم کی قوت مصرفہ یعنی اللہ اور طبیعیات و اسباب، سورہ کے تمام اشارات، قصے، مواعظ و امثال اسی مرکزی مضمون کے گرد گھوم رہے ہیں۔ غور و مطالعہ کے درمیان قرآن اور نبوت محمدی کا یہ

اعجاز بھی ان کے سامنے آیا کہ تیرہ سو برس سے پہلے چھٹی صدی عیسوی میں نازل ہونے والی اس کتاب میں سترہویں صدی عیسوی میں رونما ہو کر موجودہ بیسویں صدی تک کا احاطہ کرنے والی دجالی تہذیب و تمدن اور اس کے قائد کی مکمل اور جیتی جاگتی تصویر موجود ہے جس کو زبان نبوت کے اعجاز و ایجاز نے دجال کا نام دیا ہے[26]۔

ان حقائق کو وہ اختصار کے ساتھ اس وقت ضبط تحریر میں لائے جب وہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر کے استاذ تھے جو اس زمانے میں حیدرآباد سے مولانا مودودی کی ادارت میں نکلنے والے رسالہ ترجمان القرآن میں شایع ہوئے۔ اسی اثناء میں اس موضوع پر انہوں نے مولانا مناظر احسن گیلانی کا الفرقان میں چھپنے والا مقالہ پڑھا تو اس سورہ سے ان کی دلچسپی اور بڑھ گئی اور آخری دور سے اس سورہ کا تعلق خصوصاً دجالی فتنہ اور اس میں پوشیدہ اسباق و عبر اور معجزات وغیرہ کا مزید انکشاف ہوا[27]۔

غرض مولانا کے نزدیک دجال کی شخصیت کے خط و خال اور اس کی خصوصیات و اعمال کا موجودہ مادی تہذیب مکمل نمونہ ہے اور اس دجالی مہم میں مسیحیت اور یہودیت پوری طرح شریک ہیں جن سے اس سورہ کا گہرا تعلق ہے، اس کی ابتدا ہی مسیحیت کے عقیدے پر ضرب لگانے سے ہوئی ہے[28]۔

اس سورہ میں یہ چار قصے بیان کئے گئے ہیں (۱) کہف و رقیم والوں کا قصہ (۲) دو باغوں والے کا قصہ (۳) موسیٰ اور خضر کا واقعہ (۴) ذوالقرنین کی داستان۔

گو اس کے اسلوب و سیاق میں تنوع ہے لیکن سب قصوں کی غرض و غایت اور روح ایک ہی ہے اور ان میں بڑا گہرا معنوی ربط ہے[29]، ان میں دراصل کائنات کے بارے میں

دو نظریات و تصورات بیان کئے گئے ہیں، عموماً اس کائنات میں طبعی اسباب و قوانین کی کارفرمائی ہے اور نظام کائنات انہی تصرفات کے ماتحت ہے، اشیاء سے ان کے یہ اسباب و خواص بہت کم جدا ہوتے ہیں، انسانوں کے ایک گروہ کی نظر انہی ظواہر اور طبعی اسباب تک محدود رہتی ہے اور اس کی توجہ صرف اس دنیا اور محسوس و مادی عالم پر مرکوز رہتی ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ مسببات اور نتائج ہمیشہ ان کے تابع ہوتے ہیں، عالم موجودات کی کوئی چیز نہ اسباب و مسببات کے درمیان حائل ہو سکتی ہے اور نہ اپنے مطلق ارادے سے وہ اس میں کوئی تصرف کر سکتی ہے، اس گروہ کے نزدیک سبب کے بغیر مسبب نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ اسباب سے اس درجہ چمٹا ہوتا ہے کہ انہیں کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور پوری قوت سے اسباب و خواص سے ماوراء چیزوں کا انکار کر دیتا ہے، اس کے نزدیک حیات بعد الموت اور بعث و نشور کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی، وہ اپنی ساری صلاحیت و کوشش انہی قوتوں، اسباب و خواص اور مادیت کی تسخیر میں لگا دیتا ہے، اپنی زبان حال و قال سے اپنی الوہیت و ربوبیت کا اعلان کرنے لگتا ہے، اپنی ہی جنس کے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیتا ہے اور اپنے اغراض و خواہشات میں پڑ کر ان کے خون، مال اور عزت و آبرو کو مباح سمجھنے لگتا ہے یا پھر اپنی امت، اپنے وطن، اپنے خاندان اور اپنے گروہ کو سب سے برتر قرار دیتا ہے[۳۰]

اس نظریہ کے برخلاف دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کے طبعی اسباب و قویٰ اور اشیاء میں ودیعت کئے گئے خواص کے ماوراء ایک غیبی قوت ہے جس کے ہاتھ میں خواص و اسباب کی بھی باگ ڈور ہوتی ہے، جس طرح اسباب مسببات کا سبب ہوتے ہیں اسی طرح اللہ کا ارادہ قاہرہ خود اسباب کا سبب ہوتا ہے، وہ ان کو پیدا کرتا اور اپنی مرضی کے مطابق

چلاتا ہے جب چاہتا ہے مسببات سے ان کو الگ کر دیتا ہے، بس ارادہ الٰہی ہی اصل میں سبب الاسباب، علۃ العلل اور سلسلہ اسباب و علل کا منتہی ہے، اس کائنات کے اور ان اسباب کے خالق کے ہاتھ سے اس کی باگ ڈور کبھی اور کسی وقت نہیں چھوٹتی، نہ اسباب اس کی غلامی سے آزاد ہو سکتے ہیں اور نہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکتے ہیں، آسمان و زمین میں اس کو عاجز اور بے بس کر دینے والی کوئی چیز نہیں، وہی اپنی حکمت بالغہ اور ارادہ قاہرہ سے اشیاء کو خواص سے، مسببات کو اسباب سے اور مقدمات کو نتائج سے مربوط کرتا ہے، وہ محو و اثبات اور اشیاء کو عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہے۔ اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ[۳۱]

مولانا فرماتے ہیں اس عالم اور افراد و اقوام کے انجام میں کچھ دوسرے اسباب و مؤثرات بھی کارفرما ہوتے ہیں جو طبعی اسباب ہی کی طرح بلکہ ان سے زیادہ قوی ہوتے ہیں جن کے عواقب و نتائج بھی طبعی و مادی چیزوں سے ظاہر ہونے والے اثرات و نتائج سے بڑھ کر ہوتے ہیں اور یہ ایمان، عمل صالح، عمدہ اخلاق، اللہ کی اطاعت، عدل، عبادت، رحمت و محبت وغیرہ معنوی چیزیں ہیں جن کے بالکل برعکس معنوی اسباب کفر، بغی، فساد فی الارض، ظلم، شہوات اور گناہ وغیرہ ہیں۔ جو شخص طبعی اسباب کو معطل کئے بغیر ان صالح معنوی اسباب کا سہارا لے گا اس کے لئے یہ عالم کون ہموار اور سازگار ہو جائے گا، اس کی زندگی خوشگوار ہوگی اور اسے سہولت اور آسانی میسر کر دی جائے گی، طبعی اسباب غیر مؤثر اور اس کے سامنے سرنگندہ ہو جائیں گے اور جو ان سے مختلف معنوی اشیاء و اخلاق کو اختیار کرے گا اور محض طبعی اسباب پر اعتماد کرے گا اور ان ہی کو اپنی زندگی کی اساس بنائے گا، یہ عالم کون اس سے متحارب و متصادم ہو جائے گا[۳۲]

مولانا ابوالحسن علی کے نزدیک سورۂ کہف ایمان و مادیت کی کشمکش اور دونوں نظریوں

اور عقیدوں کی معرکہ آرائی کا قصہ ہے، مادیت اور اس کے توابع و لوازم کی ایمان بالغیب اور ایمان باللہ سے تصادم اور رزم آرائی کی داستان ہے، عقیدہ، عمل اور اخلاق کے ان دونوں نظریات کے عواقب اور اثرات و نتائج کی شرح ہے، اس میں اول الذکر نظریہ کو اختیار کرنے اور اس مادیت اور ظواہر پر بھروسہ کرنے سے بچنے کی دعوت دی گئی ہے جو اللہ اور غیب کے انکار پر مبنی ہے[۳۳]۔

اسی روشنی میں مولانا نے سورہ کے چاروں واقعات کی تشریح و توضیح کی ہے اور گو یہ عام تفسیروں کے اسلوب سے مختلف ہے تاہم اس کے متن و حاشیے میں تفسیری نوعیت کے بھی بعض مباحث ملتے ہیں مثلاً :

۱- مسیحی ادبیات سے اصحاب کہف و رقیم کے واقعہ کی جو تفصیل قلم بند کی ہے اس کے حواشی میں بعض تفسیری بحثیں اور مفسرین کے اقوال بھی نقل کئے ہیں[۳۴]۔

۲- اس قصہ کو بیان کرنے کی قرآنی حکمت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اہل تفسیر نے اس میں محمد بن اسحٰق کی اس روایت پر اعتماد کیا ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی سچائی کی جانچ کے لئے یہود نے قریش سے تین سوالات کرائے تھے جن میں ایک سوال اصحاب کہف و رقیم کے بارے میں بھی، مولانا کے نزدیک اگر یہ روایت صحیح ہو تب بھی اس واقعہ کو بیان کرنے کی تنہا یہی وجہ نہیں ہو سکتی[۳۵]، اس پر مزید تبصرہ کرنے کے بعد آخر میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی کی یہ تقریر نقل کر کے اس پر اپنی پسندیدگی ظاہر کی ہے :

"جدال و خصام نیز احکام کی ہر ہر آیت کو مفسرین کسی واقعہ سے مربوط کر دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہی واقعہ اس کے نزول کا سبب ہے، حالانکہ نزول قرآن کا اصل اور بنیادی مقصد نفوس انسانی کی تہذیب و اصلاح اور باطل اعتقادات اور فاسد اعمال کا رد و ابطال ہے، اس بنا پر لوگوں میں باطل عقیدوں کی موجودگی خود بحث و جدال کی آیتوں کے نزول کا مستقل سبب ہے اور اعمال فاسدہ اور ظلم و جور کا عام ہونا آیات احکام نازل کئے جانے کی ایک اہم وجہ ہے، اسی طرح قرآن میں مذکور اللہ کے آلاء و ایام اور موت و مابعد الموت کے واقعات سے لوگوں کا متنبہ نہ ہونا آیات تذکیر کے نازل ہونے کی حقیقی علت ہے، رہے جزئی قصے اور متعین حکایتیں جن کو نقل کرنے میں مفسرین دراز نفسی سے کام لیتے ہیں، ان کا آیات کے نزول میں نہ خاص دخل ہوتا ہے اور نہ ان کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے، سوائے چند آیتوں کے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ سے پیشتر زمانے کے کسی حادثہ و واقعہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، کیونکہ جب تک سننے والے کو اس واقعہ کی تفصیل نہ معلوم ہو تو محض اشارہ و تلمیح سے کام نہیں چلتا ہے[۳۶]۔"

۳- ذوالقرنین کی شخصیت کی تعیین میں بھی مفسرین کے اختلافات بیان کئے ہیں، وہ عام علمائے اسلام کے اس خیال کی شد و مد سے تردید کرتے ہیں کہ اس سے سکندر مقدونی مراد ہے کیونکہ قرآن مجید میں ذوالقرنین کے یہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں، ایمان و خشیت الٰہی، مفتوحین کے ساتھ عدل و رافت کا برتاؤ، سد عظیم کی تعمیر جو سکندر میں مفقود تھے[۳۷]، مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سے سائرس کو مراد لیا ہے جس کو یہود خورس اور عرب مورخین کیخسرو کہتے ہیں، مولانا علی میاں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرتے البتہ وہ استاذ سید قطب کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ نص قرآنی میں ذوالقرنین کی شخصیت اور ان کے زمانہ و مقام کی کوئی صراحت نہیں ہے، اس کا اور دوسرے قرآنی قصوں کا مقصد تاریخ قلم بند کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کے عبر و بصائر کا ذکر مقصود ہے، جس کے لئے زمان و مکان کی تحدید و تعیین ضروری نہیں ہے[۳۸]۔

ابوریحان بیرونی نے ذوالقرنین کے نام سے استدلال کرتے ہوئے ان کا تعلق حمیر سے

بتایا ہے کیونکہ حمیر کے بادشاہوں کے لقب میں "ذی" کا استعمال ہوتا تھا جیسے ذی نواس، ذی یزن وغیرہ بیرونی کے خیال میں ذوالقرنین کا اصل نام ابوبکر بن افریقش تھا، قرنی الشمس تک پہنچنے کی وجہ سے اس کا لقب ذوالقرنین پڑا[39]

مولانا علی میاں فرماتے ہیں کہ یہ خیال درست ہوسکتا ہے مگر اس کی تحقیق کے وسائل ہمارے پاس نہیں، قرآن نے یہاں جس ذوالقرنین کی سیرت و شخصیت کا ایک گوشہ بیان کیا ہے مدونہ تاریخ کی روشنی میں اس پر بحث ممکن نہیں، اس قصہ کا حال دوسرے قرآنی قصوں قوم نوح، قوم ہود اور قوم صالح جیسا ہے، تاریخ انکے بعد وجود میں آئی، اسکی تدوین سے پہلے بہت سے ایسے واقعات پیش آچکے ہیں جن کے بارے میں اس سے کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے[40]

اگر تورات تحریف و اضافے سے محفوظ ہوتی تو وہ ان واقعات کا ایک قابلِ اعتماد مرجع ہوسکتی تھی لیکن وہ جن واقعات اور روایتوں سے بھری ہوئی ہے ان کے افسانہ اور وحی الٰہی پر اضافہ ہونے میں کوئی شک و شبہ ہی نہیں۔ اس بناء پر تاریخی قصوں کے سلسلے میں وہ قطعی اور یقینی ماخذ نہیں ہوسکتی، اب صرف قرآن ہی باقی رہ جاتا ہے جو تبدیل و تحریف سے محفوظ ہے اس لئے تاریخی واقعات و قصص کا اکیلا اور تنہا ماخذ یہی ہے، لیکن قرآن مجید اور تاریخ کا محاکمہ دو وجہوں سے بداہتاً غلط ہے۔

۱۔ تاریخ ایک نومولود چیز ہے جس میں انسانی تاریخ کے بے شمار واقعات کا کوئی اتا پتا نہیں جب کہ قرآن ان واقعات کو بیان کرتا ہے جن کا علم تاریخ کے پاس نہیں۔

۲۔ تاریخ نے اگرچہ بعض واقعات کو محفوظ کیا ہے لیکن بہر حال وہ انسان کا ایک ناقص عمل ہی تو ہے جس میں ہر وہ بات ممکن ہے جو انسان کے عمل میں ہوتی ہے یعنی قصور، کوتاہی، خطا اور تحریف وغیرہ، ہم خود اس زمانے میں آئے دن دیکھتے ہیں کہ ایک ہی واقعہ اور ایک ہی

بات کو مختلف طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے مختلف زاویوں سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی متضاد توجیہات اور تفسیریں کی جاتی ہیں جب کہ اس وقت بحث و تحقیق کے اسباب و وسائل کی بڑی آسانیاں ہوگئی ہیں[41]

حقیقت یہ ہے کہ قرآنی واقعات و قصص کے بارے میں محض تاریخ کی روشنی میں کوئی بات کرنا نہ صرف یہ کہ اس مسلمہ عقیدہ کے خلاف ہے کہ قرآن ہی قول فیصل ہے بلکہ خود انسان کے پسندیدہ علمی اصول و قواعد کی رو سے بھی ناروا ہے، اسی لئے ایسی بے بنیاد بات نہ قرآن کو ماننے والا کہہ سکتا ہے نہ علمی بحث و تحقیق کے وسائل کو ماننے والا۔

کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کیا تھا تو وحی الٰہی نے ان کی سیرت کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کے علاوہ ہمارے پاس ان کی سیرت کا کوئی اور مصدر و ماخذ نہیں کہ ہم اس پر کوئی اضافہ اور توسیع کرسکیں، تفسیروں میں بے شمار اقوال درج ہیں جن پر قطعیت کے ساتھ اعتماد نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان سے احتراز ہی مناسب ہوگا کیونکہ یہ اساطیر اور اسرائیلیات ہیں۔

ذوالقرنین کی شخصیت متعین ہوجائے یا نا متعین ہی رہے، قرآن مجید کے طالب علم کے لئے دونوں صورتیں ضرر رساں نہیں ہیں[42]

مولانا کی دوسری تصانیف میں بھی کہیں کہیں آیتوں کی تفسیر اور ان سے متعلق دلچسپ نکات ملتے ہیں مثلاً ارکان اربعہ میں ایک جگہ سورہ فاتحہ کے جمال و جامعیت پر گفتگو کرتے ہوئے پوری سورہ کی تفسیر موثر اور دل نشین انداز میں کی ہے، خاص اس سورہ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہ سورہ آسمانی معجزات کا ایک لعل بے بہا اور قرآن مجید کی آیات بینات کا ایک

بے مثال شہ پارہ ہے، اگر ساری دنیا کے ذہین اور ساری قوموں کے ادیب و انشا پرداز، ماہرین نفسیات، مصلحین اخلاق اور روحانی پیشوا ایک جا ہو کر کوئی ایسا مضمون تیار کرنا چاہیں جو تمام انسانی طبقات کے لئے ان کی ضرورتوں اور خواہشات کے اختلاف کے باوجود کافی ہو اور وہ اس کے ذریعہ اپنی عبادتوں میں اپنے مافی الضمیر کو مکمل طور پر ادا کر سکیں تو وہ سورۂ فاتحہ جیسا مضمون تیار نہیں کر سکتے جو ہر انسانی گروہ اور فرد کی تسکین کے لئے کافی ہے۔"[۴۳]

ایک اور کتاب میں اسماء و صفات الٰہی کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"اللہ کے اسماء و صفات کو قرآن کے اس قدر تفصیل کے ساتھ اور دل آویز طریقہ پر بیان کرنے کا مقصد قطعاً یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بندہ سے صرف اتنا مطلوب ہے کہ وہ اس کو اپنا حاکم اعلیٰ اور آمر مطلق سمجھ لے اور اس کے اقتدار اعلیٰ میں کسی کو شریک نہ کرے۔"

ان کے نزدیک ان صفات کا تقاضا و مطالبہ یہ ہے کہ اس سے دل و جان سے محبت کی جائے، اس کی طلب و رضا میں جان کھپا دی جائے، اس کی حمد و ثنا کے گیت گائے جائیں، اٹھتے بیٹھتے اس کے نام کا وظیفہ پڑھا جائے، اسی کی دھن ہر وقت دل و دماغ میں سمائی رہے، اسی کے خوف سے انسان ہر وقت لرزاں اور ترساں رہے، اسی کے سامنے دست طلب ہر وقت پھیلا رہے، اسی کے جمال جہاں آرا پر ہر وقت نگاہیں جمی رہیں، اسی کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے مٹا دینے حتیٰ کہ سر کٹا دینے کا جذبہ بیدار رہے۔ صحابہ کرام اور عارفین امت کے تعلق سے فرماتے ہیں کہ وہ اللہ کو محض حاکم اعلیٰ اور آمر مطلق نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ ان کے نزدیک ایک معبود حقیقی کے ساتھ محبوب حقیقی اور جمال و جلال و کمال کا مبدا و منتہا ہے۔[۴۴]

عمر کے آخر دور میں مولانا کی تقریروں میں اکثر سورہ علق کی ابتدائی ۵ آیتوں سے بحث

ہوتی تھی جو ایک طرح سے ان کی تفسیر ہوتی تھی، ہم یہاں ان کی یہ تشریح و تفسیر پیش کرتے ہیں۔

اقرا: ایک نبی امی اللہ سے دنیا کی ہدایت کے لئے پیغام لینے گیا تھا، ایک امی امت اور ایک ناخواندہ ملک کے درمیان پہلی بار وحی نازل ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے "پڑھو" یہ اشارہ ہے کہ آپ کی امت صرف طالب علم ہی نہ ہوگی بلکہ معلم عالم اور علم آموز ہوگی وہ اس دنیا میں علم کی اشاعت کرنے والی ہوگی اور جو دور آپ کے حصہ میں آیا ہے وہ امیت، وحشت، جہالت اور علم دشمنی کا دور نہیں ہوگا، علم، حکمت، عقل، تمیز، انسان دوستی اور ترقی کا دور ہوگا۔

باسم ربک الذی خلق: علم کا رشتہ رب سے ٹوٹ جانا یہ بڑی غلطی تھی، وہ سیدھے راستے سے ہٹ گیا تھا، اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو یہاں جوڑا گیا اور علم کو عزت بخشنے کے ساتھ یہ آگاہی دی گئی کہ اس کی ابتدا اسم رب سے ہونی چاہئے، اس لئے کہ علم اسی کا دیا ہوا اور پیدا کیا ہوا ہے اور اسی کی رہنمائی میں یہ متوازن ترقی کر سکتا ہے یہ ایک انقلاب انگیز دعوت تھی کہ علم کا سفر خدائے علیم و حکیم کی رہنمائی میں شروع کیا جائے۔

اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم: تمہارا رب بڑا کریم ہے وہ تمہاری ضرورتوں اور کمزوریوں سے کیسے ناآشنا ہو سکتا ہے۔ قلم کا رتبہ اس سے زیادہ کس نے بڑھایا ہوگا کہ غار حرا کی پہلی وحی میں اس کو فراموش نہیں کیا گیا جو اس وقت مکہ میں کسی کے گھر ڈھونڈے سے نہ ملتا۔

علم الانسان مالم یعلم: ایک بڑی انقلاب انگیز اور لافانی حقیقت بیان کی کہ علم کی کوئی انتہا نہیں، انسان کو سکھایا جس کا اس کو پہلے علم نہ تھا، سائنس کیا ہے، ٹکنالوجی کیا ہے، انسان چاند پر جا رہا ہے، خلا کو ہم نے طے کر لیا ہے، دنیا کی طنابیں کھینچ لی ہیں۔

یہ سب علم الانسان مالم یعلم کا کرشمہ نہیں تو کیا ہے[۴۵]

۳۰ ستمبر ۹۰ء کو مولانا نے مدراس میں تقریر کرتے ہوئے سورہ انبیاء کی آیت انا انزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم الخ کی یہ تفسیر بیان کی جو اگرچہ نظائر قرآن، سیاق کلام اور عربیت سے زیادہ ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتی تاہم اس کو موضوع کی مناسبت کی وجہ سے نقل کیا جاتا ہے فرماتے ہیں:

"یہ قرآن مجید اپنے معانی، آسمانی مطالب، آسمانی مضامین، روحانی مضامین، معراجی مضامین اور مقدس مضامین کے ساتھ ہمارے لئے ایک آئینہ بھی ہے کہ ہم کو اس آئینہ میں اپنی صورت دیکھنی چاہئے کہ ہم کیسے نظر آتے ہیں"

اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ایک ایسی کتاب اتاری جس میں تمہارا تذکرہ ہے تو ہم کو اپنا تذکرہ تلاش کرنا چاہئے کہ ہم اس میں کس صف میں ہیں، کس گروہ میں ہیں، کس مرتبہ میں ہیں، اللہ ہمیں اس کی کیا جزا دے گا، ہم نے اس کی کتنی قدر کی ہے، ہمیں اپنی صورت، اپنا چہرہ اس میں تلاش کرنا چاہئے، اپنے کردار، اپنی زندگی اور اپنے طرز عمل کو اس کتاب کے نقطہ نظر، اس کتاب کے آئینہ اور سرچشمہ سے دیکھنا چاہئے۔

مولانا نے اس سلسلے میں ایک بڑے تابعی احنف بن قیس (م ۷۲ھ) کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی تو انہوں نے مصحف میں دیکھنا شروع کیا کہ میرا تذکرہ کن الفاظ سے ہے، کون سی جگہ مجھ کو دی گئی اور کس گروہ میں جگہ دی گئی مومنین کے اوصاف پر مشتمل آیات کھولتے گئے اور کہتے گئے کہ یہ صفتیں مجھ میں نہیں ہیں، مگر جب سورۂ توبہ کی یہ آیت پڑھی گئی:

وآخرون اعترفوا بذنوبھم — اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے

خلطوا عملا صالحا وآخر سیئا — اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے انہوں نے

(توبہ: ۱۰۲) — کچھ نیکیاں اور کچھ بدیاں ساتھ ہی دونوں کمائی ہیں

تو انہوں نے فرمایا ہاں یہاں میرا تذکرہ ہے اور یہ میرا گروہ ہے مولانا نے اپنے کو بھی اسی زمرہ میں جگہ دی ہے[۴۶] غالباً یہ تقریر پہلے ان کی ادارت میں نکلنے والے الندوہ میں مضمون کی صورت میں بھی چھپی تھی۔

حواشی

[۱] مولانا ابوالحسن علی ندوی: پرانے چراغ حصہ اول ص ۱۱۲ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۵ء [۲] مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی: مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۴۴-۱۴۶ مکتبہ جمعیۃ التعاون دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۴۴ء [۳] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: پرانے چراغ حصہ اول ص ۱۳۸ [۴] ایضاً ص ۱۳۶ و کاروان زندگی حصہ اول ص ۱۰۰ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۳ء/ ۴۳، ۱۴۴ [۵] پرانے چراغ حصہ اول ص ۱۴۰ تا ۱۵۰ [۶] ایضاً ص ۱۴۱ و ۱۴۲ [۷] ایضاً ص ۱۵۰ و ۱۵۱ [۸] ایضاً ص ۱۰۰ و کاروان زندگی حصہ اول ص ۱۲۹ [۹] کاروان زندگی حصہ اول ص ۱۳۹ و ۱۴۰ [۱۰] ایضاً ص ۴۳ و ۴۴ [۱۱] مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۳۷ [۱۲] ایضاً ص ۱۸۱ [۱۳] ایضاً ص ۱۸۱ [۱۴] ایضاً ص ۱۸۵ [۱۵] ایضاً ص ۱۸۷ [۱۶] پرانے چراغ حصہ اول ص ۲۳۳ [۱۷] ایضاً ص ۵۸ [۱۸] ایضاً ص ۶۵ و ۶۶ [۱۹] مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۱۸۰ و ۱۸۸ [۲۰] ایضاً ص ۱۸۸ [۲۱] ایضاً ص ۱۸۱ [۲۲] مولانا ابوالحسن علی ندوی: مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی (فہرست مضامین) ص ۱۶۵ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۱ء [۲۳] کاروان زندگی ص ۳۰ تا ۵۱ [۲۴] مولانا ابوالحسن علی ندوی: الصراع بین الایمان والمادیۃ ص ۱۲ طبع اول دارالقلم کویت ۱۹۷۱ء [۲۵] ایضاً ص ۱۱۱ [۲۶] ایضاً ص ۱۱۱ [۲۷] ایضاً ص ۱۱۱ [۲۸] ایضاً ص ۱۱۳ [۲۹] ایضاً ص ۱۶ [۳۰] ایضاً ص ۲۰ [۳۱] ایضاً ص ۲۱ [۳۲] ایضاً ص ۲۲ [۳۳] ایضاً ص ۲۲ و ۲۳ [۳۴] ایضاً ص ۲۳ [۳۵] ایضاً ص ۲۶ [۳۶] ایضاً ص ۳۰ و ۳۱ [۳۷] ایضاً ص ۴۴ و ۴۵ [۳۸] ایضاً ص ۱۰۱ [۳۹] ایضاً ص ۱۰۳ [۴۰] ایضاً ص ۱۰۳ [۴۱] ایضاً ص ۱۰۴ [۴۲] ایضاً ص ۱۰۴ [۴۳] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: ارکان اربعہ ص ۵ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۱ء [۴۴] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ص ۵۵ و ۵۶ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۰ء [۴۵] ایضاً: علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں ص ۹ تا ۱۱ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۱ء [۴۶] احمد سعید ملیح آبادی کا: روزنامہ آزاد ہند ۱۰ فروری ۲۰۰۰ء۔

الفاظ سے مشتق اقبال کی چند بصیرت افروز اصطلاحیں

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب*

کسی بھی صاحب فن کی فنی کاوش کا تجزیہ نہ صرف فن کی باریکیوں کو پیشِ نظر رکھ کر کیا جانا چاہئے اور نہ صرف فکر کی اساس پر کیونکہ اگر صاحبِ فن کی شخصیت عظیم ہے تو وہ فکر و فن دونوں کے امتزاج سے ایسا ادب پارہ وجود میں لاتا ہے جو قلب کو گرماتا اور روح کو تڑپا دیتا ہے۔ اقبال پر تو بلا مبالغہ پچھلے ساٹھ برسوں میں دس ہزار سے بھی زائد مضامین رسالوں میں شایع ہوئے مگر ان میں ان کے فنی کارناموں پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ فن نام صرف ہئیت اور اسلوب بیان کا نہیں بلکہ جتنی چیزیں بھی فن سے منسوب ہیں ان پر فکر کی ایسی آمیزش کا نام ہے کہ فن خود فکر کا حصہ بن جائے۔ ایسا ہی کچھ اقبال کی زبان و بیان پر قادر الکلامی کا ہے جہاں انہوں نے الفاظ سے مشتق قریب تین سو سے بھی زائد بصیرت افروز اصطلاحیں وضع کیں اور انہیں اپنے اشعار میں نگینوں کی طرح جڑ کر انہیں اپنی پیام رسانی کا آلہ کار بنایا۔ ایسی ساری اصطلاحیں اردو شاعری کا عظیم ورثہ ہیں۔ ایسی اصطلاحوں میں بہت سے الفاظ تو ایسے ہیں جو بظاہر دیکھنے میں بہت معمولی اور ہلکے پھلکے معلوم ہوتے ہیں مگر اقبال نے اپنی قادر الکلامی سے ان سے ایمان و یقین، اسرار و معارف اور اخلاقیات کے نکتوں کو ذہن نشین کرانے کا کام لیا۔ اس ضمن میں اقبال کی زبان و بیان پر قادر الکلامی کا عالم یہ ہے کہ وہ لفظ سے مشتق ایک ہی اصطلاح کو

* اردو نگر پھلواری شریف، پٹنہ۔

مختلف اشعار میں معنی بدل بدل کر ایسا استعمال کرتے ہیں کہ اس شعر کے موضوع کی مناسبت سے اس سے بہتر دوسری اصطلاح نہیں ہو سکتی تھی۔ الفاظ سے مشتق اصطلاحوں کا اقبال نے اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے کہ ایک فرہنگ تیار ہو سکتی ہے۔

اس مضمون میں بہ خوف طوالت الفاظ سے مشتق اقبال کی چند اصطلاحیں پیش کی جا رہی ہیں جو بصیرت افروزی کا سبق ہی نہیں دیتیں بلکہ اس دنیا میں لے جاتی ہیں جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔

کوکب، کوکبی : "کوکب" کی اصطلاح سے اقبال نے آدم یعنی انسان مراد لیا ہے، اسی معنی میں "بالِ جبریل" کی غزل ۲ (اول)، کا یہ شعر ہے ؎

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن　　زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

اس شعر میں اقبال نے اس عظیم الشان صداقت کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ اے خدا! اس دنیا کی رونق محض آدم کے دم سے وابستہ ہے اور تیری دنیا اسی کوکب کی تابانی سے منور ہے۔ اگر جذبۂ عشق ختم ہو جائے تو یہ کوکب تاریک ہو جائے گا اور زوالِ آدم خاکی سے آدم کا نقصان نہیں بلکہ خود خالق آدم کا نقصان ہوگا۔ کیونکہ جمادات، نباتات اور حیوانات تو آپ سے محبت نہیں کر سکتے اور نہ آپ کے نام پر سر کٹا سکتے ہیں یہ حوصلہ تو آدم ہی کا ہے کہ وہ آپ کے لئے سر بکف ہو کر نکلتا ہے اور اپنے خون سے آپ کی ہستی کا اثبات کرتا ہے۔

چنانچہ "رموزِ بے خودی" میں اقبال نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے ؎

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است　　پس بنائے لَآ اِلٰہ گردیدہ است

اسی نکتہ پر "بانگ درا" کی نظم "شکوہ" کے اٹھارہویں بند میں یہ شعر ہے ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے　　کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے؟

"کوکب" سے ترتیب دئے گئے متذکرہ بالا شعر ہی کے معنی میں "بالِ جبریل" کی نظم "لالۂ صحرا" کا یہ شعر بھی ہے ؎

ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

ان سارے اشعار میں ایسے تو بظاہر اقبال خدا سے مخاطب ہیں مگر وہ بلاواسطہ انسان کو یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ آدم کی تخلیق بلا مقصد نہیں کی گئی ہے۔ اس نے اس کائنات میں انسان کو خلیفۃ الارض کے منصب جلیلہ پر فائز کیا جو زبدۂ کائنات ہے۔ فرمایا گیا ہے :۔

"نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔" (الملک: ۱ و ۲)

مطلب یہ کہ اس کائنات کے متعلق انسان کی کچھ ذمہ داریاں ہیں اور وہ چونکہ اپنے فرائض کی ادائیگی سے بیگانہ ہو گیا ہے اس لئے آدم خاکی رو بہ زوال ہے۔ اس سے خدا کا تو کچھ بگڑنے والا نہیں البتہ انسان کو روزِ حشر اپنی بے عملی اور بدعملی کی خدا کے حضور جواب دہی کرنی ہوگی۔ اس لئے یہ بھی ارشاد ہے کہ :

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے۔" (المومنون : ۱۱۵)

ایک اور موقع پر اقبال ایسے تو بظاہر خدا سے مخاطب ہیں مگر بلاواسطہ انسان پر طنز کرتے ہیں کہ آنکھیں ہوتے ہوئے یہ بے بصر ہی نہیں بلکہ یہ نہ "خود بیں" ہے نہ "خدا بیں"

ہے اور نہ "جہاں بیں" ہے۔ "بالِ جبریل" کی ایک رباعی میں کہتے ہیں :

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں، نے خدا بیں، نے جہاں بیں
یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا؟

ان اشعار میں "خود بیں" سے مراد متکبر کے نہیں بلکہ وہ شخص ہے جسے اپنی خودی کی معرفت حاصل ہو۔ حقیقت پژوہی کے لئے فلسفہ ہو یا سائنس، مذہب ہو یا تصوف یہی چار طریقے ہیں اور سب کم و بیش انہی تین مسائل سے بحث کرتے ہیں۔

اقبال نے "کوکب" سے ترتیب دئے گئے شعر میں "زوالِ آدمِ خاکی" کی بات کی ہے۔ مگر اقبال ناامید نہیں ہیں کیوں کہ ان کے لئے "نومیدی زوالِ علم و عرفاں" تھی۔ چنانچہ وہ "عروجِ آدمِ خاکی" کی بھی باتیں کرتے ہیں۔ "بالِ جبریل" کی غزل ۸ (اول) میں کہتے ہیں ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اس شعر میں "انجم" بطور مجاز مرسل مستعمل ہے یعنی ساکنانِ عالمِ بالا۔ ٹوٹا ہوا تارا، کنایہ ہے حضرت آدم سے اور اس جگہ مجازاً مستعمل ہے اولادِ آدم کے لئے اور "مہِ کامل" استعارہ بالکنایہ ہے جس سے مراد ہے آدم کا اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ جانا یعنی مقامِ خلافتِ الٰہیہ پر فائز ہو جانا۔ انہی معنوں میں "عروجِ آدمِ خاکی" سے کلام میں ایک اور شعر اسی مجموعہ کی غزل ۴۶ کا یہ ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

"کوکب" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں درج ذیل چار اشعار اور ہیں جو علی الترتیب "بانگِ درا" کی نظمیں "آفتابِ صبح"، "مسلم"، "جوابِ شکوہ" کے اکتیسویں بند اور "تضمین بر شعر ابوطالب کلیم" میں ہیں :

صفحۂ ایام سے داغ مدادِ شب مٹا　　آسماں سے نقشِ باطل کی طرح کوکب مٹا

قسمت عالم کا مسلم کوکب تابندہ ہے　　جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے

زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری　　کوکب قسمت امکاں ہے خلافت تیری

وہ نشانِ سجدہ جو روشن تھا کوکب کی طرح　　ہو گئی ہے اس سے اب ناآشنا تیری جبیں

پہلے شعر میں اقبال نے "کوکب" سے ستارہ مراد لیا ہے۔ دوسرے شعر میں وہ مسلمانوں کو "کوکب تابندہ" سے تعبیر کرتے ہوئے یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ مسلمان دنیا کی تقدیر کا روشن ستارہ ہے۔ یعنی دنیا کا عروج مسلمانوں کے عروج سے وابستہ ہے اور یہ ستارہ صبح کی روشنی سے بھی زیادہ چمکیلا ہے۔ اس شعر کو اس کے قبل کے درج ذیل شعر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس شعر کا پس منظر اور واضح طور پر سامنے آتا ہے ؎

میری ہستی پیرہن عریانیِ عالم کی ہے　　میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

ان دونوں اشعار میں اقبال نے اسی "کوکب" یعنی مسلمانوں کے وجود کو دنیا کی زینت کا باعث بتا کر یہ تلقین کی ہے کہ اگر دنیا مسلمانوں کے وجود سے خالی ہو جائے تو انسانیت ذلیل اور رسوا ہو جائے گی۔

تیسرے شعر میں اقبال نے "کوکب" سے ایک ترکیب "کوکبِ قسمت امکاں" وضع کی ہے جس سے وہ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ دنیا محض مسلمانوں کے وجود سے قائم ہے اور یہ کہ دنیا میں اسلام کی حکومت تقدیر ہو چکی ہے۔

چوتھے شعر میں اقبال یہ تلقین کرتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں کو شعائر صاحبِ یثرب کا پاس تھا اور ان کی زندگی پکار پکار کر ان کے مسلمان ہونے کا ثبوت دیتی تھی مگر اب تیری پیشانی پر سجدہ کا نشان تک نظر نہیں آتا۔ جس نشان میں ستاروں کی چمک

تھی تیری جبیں اب اس سے ناآشنا ہو گئی ہے یعنی تجھ میں اب عشق رسولؐ باقی نہیں ہے۔

اقبال نے "کوکب" سے ایک اصطلاح "کوکبی" بھی وضع کی ہے جس سے وہ تابندگی مراد لیتے ہیں۔ اس اصطلاح سے کلام میں ایک ہی درج ذیل شعر "بالِ جبریل" کی نظم "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں" میں ہے ؎

سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن　　تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے بنایا ضرور ہے مگر اس کا جوہر حیات (روح) خاکی نہیں بلکہ روحانی و نورانی ہے اس لئے اس میں تابندگی اور درخشندگی کی صفت پائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کے جسم میں جیسا سورۃ الحجر کی آیت ۲۹ میں ارشاد ہے، خود "اپنی روح سے کچھ پھونک دیا ہے جو دراصل صفات الٰہی کا ایک عکس یا پرتو ہے اور اسی پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار پایا۔

قرآن کا مخاطب انسان ہے اس لئے ہر زمانے میں حکیموں اور فلسفیوں نے انسان ہی کی تفتیش کو موضوع بنایا۔ اقبال نے بھی اپنے سارے کلام میں خدا سے زیادہ اس انسان کی تلاش کی ہے جسے جامِ شعور پلا کر خدا نے دنیا میں بھیجا تھا۔ اقبال اور انسان کے موضوع پر منفرد اشعار کے علاوہ "بانگ درا" کی نظمیں "انسان اور بزم قدرت"، "سرگزشتِ آدم"، "انسان" (بعد از نظم "عشرت امروز") "انسان" (بعد از نظم "موٹر") "بالِ جبریل" کی نظمیں "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں" اور "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" اور "ضرب کلیم" کی نظم "زمانۂ حاضر کا انسان" اس تلاش پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔

فقرِ غیور "فقرِ غیور" کے لغوی معنی تو غیرت مند فقر کے ہیں مگر اقبال نے اسے لغوی معنی کے علاوہ اسلام اور روحِ اسلام کے معنوں میں بطور استعمال کیا ہے۔ "ضرب کلیم"

کی نظم "سلطانی" میں اس فقر کی ماہیت اقبال یہ بتاتے ہیں ؎

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی

اقبال کے تصورِ فکر میں غیرت مندی سب سے اہم چیز ہے۔ "ارمغانِ حجاز" کی نظم "بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" میں کہتے ہیں ؎

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

"فقرِ غیور" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل چار اشعار ہیں۔ پہلا شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "فقر و ملوکیت" میں ہے ؎

اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم

اس شعر میں اقبال "فقرِ غیور" کو اسلام کے مترادف قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ اب اسلام کی کامیابی کا دور آنے والا ہے کیونکہ اقوام یورپ کے سامنے کوئی اخلاقی نصب العین نہیں ہے۔ وہ سب دولت اور استعمار کے حرص میں مبتلا ہیں اور اس ناپاک جذبہ کی بنا پر ان کی اخلاقی حالت بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ اس شعر میں "روحِ فرنگی" سے مراد یورپ کی مادہ پرستانہ اخلاقیات ہے۔

"فقرِ غیور" سے دوسرا شعر اسی مجموعہ کی نظم "اسلام" میں ہے۔ کہتے ہیں ؎

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر دوسرا نام اسی دین کا ہے "فقرِ غیور"

اس شعر میں اقبال نے اسلام ہی کا نام "فقرِ غیور" قرار دیا ہے۔ غیور اس لئے کہا گیا چونکہ اس میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے غیرت مخفی ہے۔ اقبال کے نزدیک اگر فقر میں خودداری یعنی دین کے لئے غیرت نہ ہو تو وہ فقر نہیں ہے بلکہ قہرِ الٰہی ہے لیکن اگر اس میں یہ جوہر موجود ہے تو بلاشبہ اللہ دنیا میں مومن کے لئے سربلندی اور امیری کی بنیاد بن جاتا ہے۔ چنانچہ

"ضربِ کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے پندرہویں بند میں کہتے ہیں ؎

خوددار نہ ہو فقر تو ہے قہرِ الٰہی ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہیدِ امیری

"فقرِ غیور" کے متذکرہ بالا تصریحات کے پس منظر میں "ضربِ کلیم" ہی کی غزل (بعد از نظم "فقر و راہبی") کا یہ شعر بھی ہے ؎

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

اس شعر میں عشق سے مراد عشقِ رسولؐ ہے اور فقر سے مراد ذکر و فکر کا اختلاط ہے۔

"فقرِ غیور" سے تیسرا شعر اسی مجموعہ کی نظم "جاوید سے" کے تیسرے بند میں ہے ؎

یہ فقرِ غیور جس نے پایا بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی

اس شعر میں اقبال فقرِ غیور کی ماہیت یہ بتاتے ہیں کہ جو مسلمان اسے اختیار کر لیتا ہے وہ اپنی زبان سے وہی کام لیتا ہے جو ایک غازی تیغ و سناں سے لیتا ہے۔ یعنی صاحبِ فقر اور غازی دونوں جہاد کرتے ہیں۔ غازی تلوار سے کفر کا مقابلہ کرتا ہے اور فقیر اپنی زبان سے۔

اقبال اس نظم کے اس بند میں اپنے صاحب زادے جاوید اقبال کو (جو پاکستان سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے) جو اس وقت زیرِ تعلیم تھے۔ اگر فقر کا درس دیتے ہیں تو انہیں یہ بھی درس دیتے ہیں، جس کا اطلاق عام مسلمانوں پر ہوتا ہے کہ:

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا اللہ کی شان بے نیازی

"فقرِ غیور" سے چوتھا اور آخری شعر اسی مجموعہ کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے پہلے بند میں ہے ؎

اے مرے فقرِ غیور فیصلہ تیرا ہے کیا خلعتِ انگریز یا پیرہن چاک چاک

اس شعر میں اقبال نے "فقر غیور" سے شان استغنا مراد لیا ہے۔ محراب گل اپنی شان استغنا سے خطاب کرکے اپنی افغان قوم کو جو انگریزوں سے برسر پیکار تھی، کہتا ہے کہ انگریزوں کی غلامی اختیار کرکے اس کی خلعتِ فاخرہ پر، جو ضمیر فروشی سے حاصل ہوتی ہے۔ میں اپنے پھٹے ہوئے پیرہن کو ترجیح دیتا ہوں، کیونکہ اس میں غیرت کا مادہ ہے۔

فقیری، میری: اقبال "فقیری" کی اصطلاح سے مسکینی و ناداری مراد نہیں لیتے بلکہ شان بے نیازی مراد لیتے ہیں۔ اگر وہ اپنے لڑکے جاوید کو اس فقر کو ڈھونڈنے کی صلاح دیتے ہیں جس "فقر کی اصل ہے حجازی" (جس حجازی سے مراد قرانی ہے)، تو وہ "فقیری" میں "بوئے اسداللّٰہی" کا ہونا بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی شانِ بے نیازی کو مثالی بنا کر "بال جبریل" کی غزل ۴۴ میں کہتے ہیں ؎

داراو سکندر سے وہ مرد فقیر اولی　　　ہو جس کی فقیری میں بوئے اسداللّٰہی

"میری" کی اصطلاح سے اقبال سرداری مراد لیتے ہیں۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین[۳] درج ذیل اشعار ہیں۔ جو سب "بال جبریل" میں ہیں۔ پہلا شعر اس مجموعہ کی نظم "دین وسیاست" کا ہے ؎

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی　　　سماتی کہاں اس فقیری میں میری

اس شعر میں اقبال نے رہبانیت کی مذمت کی ہے جو خالص نصرانیت کی ایجاد ہے۔ اور مسکینی اور دل گیری بلکہ غلامی کی مترادف ہے۔ قرآن خود اس رہبانیت کی مذمت کرتا ہے۔ اور اسے بدعت قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہے:

"اور رہبانیت انھوں (حضرت عیسیٰؑ کے پیروؤں) نے خود ایجاد کرلی، ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا، بلکہ اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے آپ ہی یہ بدعت نکال لی اور

پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے ان کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا، مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں"۔ (الحدید: ۲۷)

اسی لئے اقبال کہتے ہیں کہ رہبانیت کی فقیری وہ فقر نہیں جو اسلام کی روح ہے کیونکہ اس فقیری میں سرداری کی گنجایش نہیں۔ اس کے برعکس "میری" کی اصطلاح سے نظم "فقر" میں وہ اس فقیری کو اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں جس کی روح قرآنی ہے۔ حضرت امام حسینؓ کو مثالی بنا کر کہتے ہیں ؎

اک فقر ہے شبیری، اس فقر میں ہے میری　　　میراث مسلمانی، سرمایہ شبیری

"میری" سے تیسرا شعر اس مجموعہ کے درجِ ذیل قطعہ میں ہے۔ جس کا عنوان "سوال" ہے۔

اک مفلس خود دار یہ کہتا تھا خدا سے　　　میں کر نہیں سکتا گلۂ دردِ فقیری
لیکن یہ بتا، تیری اجازت سے فرشتے　　　کرتے ہیں عطا مردِ فرومایہ کو میری؟

اس شعر میں اقبال نے فطرت انسانی کی ترجمانی کی ہے کیونکہ جو شخص بھی غور وفکر کرسکتا ہے اس کے دماغ میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں کم ظرفوں اور ناداروں کو میری یعنی سرداری اور حکومت کیوں حاصل ہوجاتی ہے۔ دراصل اس قطعہ میں اقبال نے جو سوال کیا ہے۔ اس کا مقصد محض انسان کی بے مائگی اور بے چارگی کا اظہار ہے۔

فقیری، امیری، وزیری، سربزیری: "فقیری" کی ماہیت اس کے قبل کے ذیلی عنوان میں گزر چکی ہے۔ "امیری" سے اقبال کی مراد سرداری اور حکومت اور "وزیری" سے حکومت کی نمائندگی ہے۔ "امیری" کی اصطلاح سے کلام میں کل سات درج ذیل اشعار ہیں جو علی الترتیب "بال جبریل" کی ایک رباعی اور اس مجموعہ کی نظمیں "دین وسیاست" اور "جاوید کے نام" (بعد از نظم "ستارے کا پیغام") میں ہیں اور اس کے بعد دو[۲] "ضرب کلیم" کی نظم "جاوید" سے

کے تیسرے بند اور نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے پندرہویں بند میں ہیں اور ایک "ارمغان حجاز" کی ایک رباعی میں ہے۔ "وزیری" سے کلام میں ایک ہی شعر ہے جو تیسرے شعر میں "امیری" کے ساتھ آئی ہے:

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری ۔۔۔ رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ ۔۔۔ نہیں ممکن امیری بے فقیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ۔۔۔ ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے ۔۔۔ خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر
مومن کی اسی میں ہے امیری ۔۔۔ اللہ سے مانگ یہ فقیری
خود دار نہ ہو فقر تو ہے قہر الٰہی ۔۔۔ ہو صاحب غیرت تو ہے تمہید امیری
غریبی میں ہوں محسود امیری ۔۔۔ کہ غیرت مند ہے میری فقیری
حذر اس فقر و درویشی سے جس نے ۔۔۔ مسلماں کو سکھا دی سربزیری

پہلا اور دوسرا شعر رباعی کا ہے جن میں اقبال مسلمانوں کی موجودہ حالت پر تاسف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نہ تو مسلمانوں میں اب ایمان کا رنگ ہے اور نہ انہیں "امیری" یعنی حکومت ہی حاصل ہے۔ رہے صوفی تو وہ بہت ہیں مگر ان میں "روشن ضمیری" یعنی روحانیت کی شان نظر نہیں آتی، اس لئے وہ مسلمانوں کو اسی شانِ فقر کے حصول کی دعا کرنے کی صلاح دیتے ہیں جو اسلاف میں پائی جاتی تھی۔ دوسرے شعر میں "وہی" اشارہ اسلاف کے جذبۂ ایمانی اور شانِ فقر کی طرف ہے کیونکہ جب تک فقیری کی شان پیدا نہیں ہوگی تو امیری نہیں کر سکتا۔

تیسرے شعر میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ جب مذہب اور سیاست میں

تفریق ہوگئی تو اربابِ حکومت نے خدا کے بجائے نفس امارہ کی پرستش شروع کر دی۔ اسی کو اقبال نے "ہوس کی امیری" اور ہوس کی وزیری" کہا ہے۔ اربابِ حکومت کے اسی نفسِ امارہ کی پرستش کو جو "دین و دولت" کی جدائی سے ظہور پذیر ہوتی ہے اقبال نے "بال جبریل" کی غزل ۷، میں "چنگیزی" کا نام دیتے ہوئے اس تفریق کے مضر اثرات پر یوں روشنی ڈالی ہے

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو ۔۔۔ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

چوتھے شعر میں "فقیری" سے مراد غریبی اور "امیری" سے مراد عزت، شہرت اور ناموری ہے۔ اس شعر میں اقبال اپنے لڑکے جاوید کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ اگر انسان ہمت اور استقلال سے کام لے تو غریبی میں بھی نام پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے تو وہی طریق اختیار کر جو میرا ہے یعنی غریبی میں نام پیدا کر۔ دوسری بات یہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ انسان عزت، شہرت اور ناموری کے لئے اپنی خودی کو بیچتا اور ضمیر فروشی کرتا ہے اس لئے تو ایسی ضمیر فروشی سے اجتناب کرنا۔ "بال جبریل" کی نظم "خودی" میں اسی نکتہ کو استعارے میں اس طرح پیش کرتے ہیں ؂

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض ۔۔۔ نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

پانچویں شعر میں اقبال اپنے لڑکے جاوید کو ان ہی باتوں کی نصیحت کرتے ہیں۔ اس شعر میں "اسی" سے مراد "فقر غیور" ہے جو اس شعر کے قبل آیا ہے اور جس شعر پر روشنی اس کے قبل کے ذیلی عنوان "فقر غیور" کے تیسرے شعر میں ڈالی جا چکی ہے ؂

یہ فقر غیور جس نے پایا ۔۔۔ بے تیغ و سناں ہے مرد غازی

چھٹا شعر قبل کے ذیلی عنوان "فقر غیور" کے دوسرے شعر میں آچکا ہے جس پہ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

ساتواں اور آٹھواں شعر "ارمغان حجاز" کی رباعی کا انہیں معنوں میں ہے جن معنوں میں اوپر چوتھا شعر ہے۔

"سربزیری" سے کلام میں کل دو ہی اشعار ہیں۔ اس اصطلاح سے ایک شعر تو "ارمغان حجاز" کی رباعی میں گزر چکا۔ دوسرا شعر "بال جبریل" کی نظم "دین و سیاست" میں ہے ؎

خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری

"سربزیری" سے اقبال کی مراد صرف غلامی ہی نہیں بلکہ ذلت، نکبت اور نامرادی بھی ہے۔ اس شعر کو اس کے قبل کے ذیلی عنوان "فقیری میری" میں "میری" سے ترتیب دیئے گئے پہلے شعر کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ شعر پوری گرفت میں آجاتا ہے۔

یہ تھیں چند معمولی اور ہلکے پھلکے الفاظ سے مشتق اقبال کی چند بصیرت افروز اصطلاحیں جن میں اقبال نے ایمان و یقین، اسرار و معارف، تصوف و فلسفہ کے سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ جہاں تک بصیرت کی بات ہے "بال جبریل" کی ایک رباعی میں اقبال نے دعا کی ہے ؎

خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

یہ چند بصیرت افروز اصطلاحیں اقبال کی اسی نور بصیرت کو عام کرنے کی سمت میں ایک حقیر سی کوشش ہے۔

معارف کی ڈاک

(۱)

ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، لکھنؤ

محترم و معظم جناب مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی زیدت مکارمہ

ناظم دار المصنفین۔ اعظم گڈھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر و صحت ہوگا، آپ کا عنایت نامہ مجھے موصول ہوا، اس سے قبل معارف کا اداریہ دیکھا، آپ نے جس تعلق خاطر اور قدر کے ساتھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ فرمایا ہے وہ آپ کے خلوص و محبت کا پوری طرح غماز ہے، پھر زبان و اسلوب بیان میں بھی منفرد حیثیت رکھتا ہے، پڑھ کر دل پر اثر پڑا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو دار المصنفین کے ساتھ جو مخلصانہ اور قدردانہ ربط و تعلق تھا اس کے اعتراف و قدر کا آپ نے حق ادا کر دیا، میں جانتا ہوں اور دیکھتا رہا ہوں کہ دار المصنفین کے بقا و ترقی کی حضرت مولانا کو کیسی فکر رہتی تھی اور جب اس کے تذکرہ کا موقع ہوتا تو فکر و دلچسپی کے الفاظ سے کرتے اور کہتے کہ اس کی بہتری کے لئے جو کیا جا سکتا ہو کرنا چاہئے، اس کو اپنا ادارہ اور ایسا ادارہ سمجھتے جیسا خود اپنا یا اپنے باپ دادا کا قائم کردہ ادارہ ہو، یہ بات ندوہ کے ساتھ بھی تھی جیسا کہ آپ نے بھی لکھا ہے ان کی یہ دلچسپی دیکھ کر ہم کو بھی فکر ہونے لگتی تھی کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہئے، اب مولانا رحمۃ اللہ علیہ ہم میں نہیں رہے لیکن ان کی باتیں اور ان کی فکریں ہمارے سامنے ہیں، ان کا حق ادا کرنے کی ہم پر ذمہ داری ہے، ندوہ کے اہل شوریٰ نے مجھ پر ذمہ داری ڈالی ہے یہ میری سطح سے بہت بلند ہے لیکن ان کو حسن ظن ہوا ہے، دیکھئے کتنا صحیح ثابت ہوتا ہے، دار المصنفین کو تو

الحمدللہ آپ جیسا کارپرداز و صاحب معیار شخص حاصل ہے، اللہ تعالیٰ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وہ نیک تمنائیں جو ندوۃ العلماء اور جو دارالمصنفین کے لئے تھیں پورا فرمائے۔

نماز جنازہ میں شرکت کے لئے آپ تشریف لائے اور مجھ سے ایسے حالات میں ملاقات ہوئی اور ٹھنڈک سے ایسا حال بنا ہوا تھا کہ فی الفور نہ سمجھ سکا کہ آپ ہیں، آپ ابھی واپسی کے لئے پابہ رکاب تھے کہ آپ کی آمد پر اظہار قدر نہ کر سکا اور نہ آپ کو آرام کرنے کے لئے اور کھانے کے لئے روک سکا جس کا اثر طبیعت پر رہا۔ پھر مسلسل تعزیت کے لئے آنے والوں اور تعزیتی خطوط نے وقت کو ایسا مشغول رکھا کہ آپ کو میں خط بھی نہیں لکھ سکا۔

بہرحال آپ نے بڑی عنایت فرمائی کہ ایسے سخت موسم میں سفر کیا اور اپنی رات بے آرامی میں گذاری، اللہ تعالیٰ اس کا بہترین صلہ دے۔

بمبئی اور علی گڑھ کے سیمیناروں میں میں بھی مدعو ہوں، علی گڑھ کا تو ارادہ ہے لیکن بمبئی قابل عمل نہیں معلوم ہو رہا ہے، علی گڑھ کے عربک ڈپارٹمنٹ کے سیمینار میں بھی شرکت نہ کر سکا، گذشتہ دنوں مشغولیت بھی بہت رہی، ندوہ کی مجلس انتظامی کے ساتھ مجلس تحقیقات و نشریات کی بھی نشست ہے، آپ تشریف لاسکیں تو بہت خوشی ہوگی لیکن دشواری اور مشقت ہو تو اصرار نہیں ہے، بمبئی کے پروگراموں میں آپ کی شرکت دارالمصنفین کی مصلحت میں بھی ہے اس لیے اس کو غالباً ترجیح ہوگی۔

پرسنل لا بورڈ کے جلسہ کے موقع پر دارالمصنفین کے جلسہ کا انعقاد امید ہے کہ موزوں رہے گا۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔

والسلام

مخلص: محمد رابع ندوی

(۲)

آج کل (اردو)، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔

۱۴ مارچ ۲۰۰۰ء

مولانائے مکرم! السلام مسنون۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

جناب کا نوازش نامہ مل کر باعث صد افتخار و مسرت ہوا۔ معارف میں جناب کے تاثرات پڑھ کر میں نے دانتوں میں انگلی دبالی۔ اللہ اللہ کیا الفاظ آپ لائے ہیں اور کس طرح سے جوش و جذبہ اور عقیدت کے تحت آپ نے مولانا کو دلی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ میں ایسی تحریر کے لئے آپ کو مبارکباد دینا چاہتا تھا۔ لیکن دفتر کی دیگر مصروفیات کے تحت بھول گیا تھا کہ آپ کے کارڈ نے مہمیز لگائی۔

میرے سلسلے میں آپ نے جو مبالغہ آرائی کی ہے وہ یقیناً میرا دماغ خراب کرنے کے لئے کافی ہے۔ بہرحال ان ہمت افزا کلمات کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔ میرے پاس واقعی الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کے مضمون کی تعریف کر سکوں اور کیوں نہ ہو، وہ مضمون بھی کس شخصیت سے متعلق تھا اور آپ نے حق رفاقت ادا کر دی۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے ان کے احسانات اور ان کے قرض کی ادائیگی آپ نے بہ کمال تمام ادا کر دی۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آمین!

مخلص: محبوب الرحمن فاروقی

(۳)

دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں، رائے بریلی

۸ر ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ

مخدوم و معظم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہوں گے، اپنے حضرت نور اللہ مرقدہ و برد مضجعہ کے سانحہ ارتحال پر آنجناب کا مضمون بار بار پڑھا گیا، دل سے نکلی تحریر نے ہم سبھوں کو متاثر کیا، حضرتؒ کو آپ سے خاص تعلق تھا! اس تعلق کی یاد آج اس وقت تازہ ہوگئی جب راقم اپنی وہ ڈائری دیکھ رہا تھا جو حضرتؒ کے متعلق لکھا کرتا تھا، منگل ۳ / رمضان ۱۴۱۵ھ کا تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی کا صفحہ کھلا، تحریر تھا کہ :

"مغرب بعد ہمیں کھانے کے وقت دارالمصنفین کے ناظم اور مدیر معارف مولانا ضیاء الدین اصلاحی حاضر خدمت ہوئے، حضرتؒ کھڑے ہوکر ان سے ملے اور اکرام کیا، عشاء بعد مجلس میں جیسے ہی وہ کمرہ میں آئے حضرتؒ نے حاضرین سے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ دارالمصنفین کے ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی ہیں، ان کو پہچان لیجیے۔ بعد میں آپ لوگ فخر کریں گے"۔

اللہ رب العزت ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خوب درجات بلند فرمائے، ان کے معارف و افکار کو خوب عام فرمائے اور ان کی جملہ مساعی و خدمات کو پورے طور سے قبول فرمائے۔

حضرتؒ یاد آتے ہیں، ان کی بزرگانہ شفقتیں، عنایتیں اور اعلیٰ درجہ کا اخلاق کہ وہ پیکر خلق عظیم تھے یاد آتا ہے اور ان کے تعلق والے بھی یاد آتے ہیں۔ دعا کی نیازمندانہ درخواست ہے کہ اس کا بہت ہی محتاج ہوں۔

جامعہ سید احمد شہید کٹولی لکھنؤ میں حضرتؒ کی آفاقی شخصیت پر ۲۸-۲۹-۳۰ مارچ کو سمینار کا انعقاد ہو رہا ہے۔ امید ہے آنجناب کی اس موقع پر تشریف آوری ہوگی اور ملاقات کا شرف حاصل ہوگا۔

والسلام مع الاکرام

محمود حسن حسنی ندوی

مطبوعات جدیدہ

اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ از جناب ڈاکٹر غلام رسول ساجد

متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت مناسب، مجلد مع گردپوش، صفحات ۶۴۰، قیمت ۳۰۰ روپے پتہ: ۱۰/۷، سی بلاک نوبا بھاوے نگر، پائپ روڈ کرلا (ویسٹ) ممبئی ۴۰۰۰۷۰ اور انجمن ترقی اردو کے مکتبے۔

اردو ادب اور اس کے مختلف اصناف کی تاریخ کے متعلق ذخیرۂ کتب کو موضوع تحقیق بنانا آسان کام نہیں، انتخاب کی حدو قید بھی اس کے لئے کافی نہیں لیکن زیر نظر ضخیم کتاب میں لائق مصنف نے اس مشکل اور دشوار گزار راہ کو بڑی خوبی سے طے کیا، پی ایچ ڈی کے لئے ان کا یہ مقالہ یونیورسٹیوں کے موجودہ معیار کے برخلاف تحقیق و تفحص اور مطالعہ و سلیقہ کا عمدہ نمونہ ہے، سات ابواب میں اردو زبان و ادب اور تذکرہ و تاریخ نویسی کی ابتدا و ارتقا پر بحث کرنے کے بعد تاریخ ادب نیز اردو کی علاقائی، دبستانی، تحریکی، اصنافی اور تدریسی تاریخ کی قریب پونے دو سو کتابوں کا جائزہ اس طرح لیا گیا ہے کہ ان کے حسن و قبح اور نقص و امتیاز کا متوازن اور غیر جانب دار تجزیہ سامنے آجاتا ہے، تذکرہ نویسی اور تاریخ نگاری کے درمیان آب حیات کو درمیانی کڑی سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے بعد خم خانہ جاوید، گل رعنا، اور شعر الہند جیسی کتابوں کی زمین ہموار ہوئی، یہ سلسلہ ۱۹۸۵ء تک کی مطبوعات پر محیط ہے، اس سے لائق مصنف کی غیر معمولی جاں نشانی و دیدہ ریزی کا اندازہ ہوتا ہے، ہر صنف ادب کی کتابوں کے مفصل تعارف کے بعد مجموعی طور پر ان کے متعلق تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔

البتہ بعض عبارتیں واضح نہیں ہیں مثلاً "... کیونکہ منطقی رویہ سے تحقیقی دلائل قابل قبول نہیں ہوتے" ص ۲۷۲ "مقالہ نگار کو یقین نہیں ہے پھر بھی ان کا تذکرہ بے سود ہے" ص ۲۷۵ "زیر نظر گراں مایہ تصنیف کے ہر باب کی تکنیک ہے سیاسی و سماجی پس منظر، مختصر شعراء و ادبا کے حالات ..." ص ۲۹۵ "... دکن میں مسلمان خاندان کے عروج کے ساتھ یہ زبان بھی آگے بڑھی ظاہر ہے کہ ادبی تاریخ کی دنیا میں اب یہ تھیوری فرسودہ ہو چکی ہے" ص ۳۰۵، اسی طرح ص ۲۶۸ کا آخری جملہ وغیرہ، بعض عبارتیں ناقص و ناتمام ہیں جیسے "مولف کا بیان ہے گریرسن، محی الدین قادری زور، محمود شیرانی، مسعود حسین خاں، شوکت سبزواری، سید سلیمان ندوی وغیرہ نے" ص ۲۶۵، اس کے بعد دوسرا پیراگراف شروع ہو جاتا ہے، یہ کہنا بھی درست نہیں کہ مہدی افادی کے خطوط میں غالب کے انداز بیان کا عکس ملتا ہے، کتابیات میں نول کشور پریس سے شایع ہونے والی صفا بدایونی کی شمیم سخن کا سن اشاعت ۱۹۹۱ء دیا گیا ہے جو غلط ہے، فہرست مضامین کو شروع میں اور بہتر شکل میں ہونا چاہیئے، ان تسامحات کے باوجود یہ کتاب اپنے موضوع پر بڑی مفید و مستحسن کوشش ہے اور اس کے لئے لائق مصنف اور ان کے فاضل اساتذہ شیخ فرید، آدم شیخ اور پروفیسر خورشید نعمانی بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اردو تنقید کا سفر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تناظر میں: از جناب ڈاکٹر تابش مہدی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۰۰، قیمت ۲۰۰ روپئے پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی اور مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

یہ کتاب بھی اصلاً ایک تحقیقی مقالہ ہے، جس میں اردو تنقید کے میدان میں جامعہ

ملیہ اسلامیہ سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور نقادوں کی خدمات کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے، آغاز سے اب تک جامعہ کے در و دیوار متعدد نامور اصحاب فکر و نظر سے معمور رہے ہے، اس علمی روایت و تسلسل کی نعمت کم تعلیمی اداروں کو حاصل رہی، خوشی ہے کہ اس قابل قدر میراث کے ایک پہلو یعنی فن تنقید کے مجموعی جائزے پر توجہ کی گئی، شروع کے قریب سوا سو صفحات میں تنقید کے مفہوم، اردو تنقید کے ابتدائی نقوش اور پھر مختلف تنقیدی نظریات و مکاتب فکر کے سلسلے میں حالی و شبلی سے آل احمد سرور تک چند اہم نقادوں کے طرز تنقید کا عمدہ تجزیہ کیا گیا ہے، اس کے بعد تین ابواب میں خاص جامعہ کے اہل نقد و نظر کا ذکر ہے جس کو زمانی ترتیب سے ۱۹۴۷ء سے پہلے اور مابعد کے دور میں تقسیم کیا گیا ہے، مولانا اسلم جیراجپوری، سعید انصاری اور سید وقار عظیم کا تعلق دور اول سے اور ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر مجیب، عبداللطیف اعظمی اور پروفیسر مسعود حسین کا ذکر تقسیم ہند کے بعد کے نقادوں میں ہے، ہم عصر تنقید کا باب نسبتاً زیادہ تفصیل سے ہے اور درحقیقت یہی دور زیادہ درخشاں اور نمایاں ہے جس میں تنویر احمد علوی سے قاضی عبیدالرحمن ہاشمی تک چودہ نقادوں کا ذکر ہے ان میں گوپی چند نارنگ، منظر اعظمی، مظفر حنفی، عنوان چشتی اور شمیم حنفی وغیرہ جیسے معروف نقاد شامل ہیں، کتاب کے بارے میں یہ تاثر درست ہے کہ اس سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تنقید کی روایت سے واقفیت حاصل ہونے کے علاوہ مختلف ادوار میں اس کے اساتذہ کی انفرادی کوششوں کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اسلوب اور زبان کی شائستگی اس کتاب کی بڑی خوبی ہے۔ البتہ یہ جملہ کھٹکتا ہے کہ نیاز فتح پوری کی نگاہ بہت شارپ تھی"، مولانا اسلم جیراجپوری کے اس قول کے متعلق

کہ "تصوف اور حسن میں قدیمی آشنائی ہے، جس قدر صوفیہ گزرے ہیں سب کا نام عشاق کی فہرست میں شامل ہے" بڑے پتے کی بات کہنا بھی محل نظر ہے۔

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ از جناب پروفیسر عبدالرحمن مومن، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت بہترین، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۱، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، بی ۳۵ (بیسمنٹ) حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی ۔۱۳۔

یہ کتاب خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے سوانح اور احوال و کوائف کے سلسلے کی ایک اور کڑی ہے جس میں خواجہ صاحب کی تعلیمات اور ان کی جامعیت، معنویت اور افادیت کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، فاضل مصنف کا خیال ہے کہ گو خواجہ صاحبؒ کے حالات پر متعدد کتابیں شایع ہوچکی ہیں لیکن حضرت کے ظاہری و باطنی کمالات کو کما حقہ اجاگر کرنے کا فریضہ اب تک ادا نہیں کیا گیا، ان کے اس خیال سے مکمل اتفاق مشکل ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ زیر نظر کتاب میں انہوں نے خواجہ صاحبؒ کی سیرت و شخصیت اور تعلیمات و ملفوظات کو کتاب و سنت کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے شروع میں تصوف کی اصلیت اور کتاب و سنت سے اس کی مطابقت کے متعلق سنجیدہ اور متوازن خیالات کا اظہار بھی ہے، خواجہ صاحبؒ کی سیرت میں زہد، حسن خلق، اخلاص، استقامت، تسلیم و رضا اور مخالفت نفس جیسے اوصاف و محاسن پر خاص توجہ کی گئی ہے گندم نما جو فروش صوفیوں کے ذکر سے اصل تصوف کے متعلق فاضل مصنف کے احساس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

المحبوب از جناب محمد نصیر الدین ہاشمی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ

و طباعت، مجلد صفحات ۱۸۶، قیمت درج نہیں، پتہ: کتب خانہ خواتین دکن و ادارہ تحقیقات ۱/۳-۵-۱۰، مان صاحب ٹینک حیدرآباد ۲۸ ... ۵۰۰ اے پی۔

"دکن میں اردو" والے جناب مولوی سید نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے بیس سال کی عمر میں محبوب دکن میر محبوب علی خاں آصف سادس کی یہ سوانح حیات مرتب کی تھی جو ان کی اولین علمی کاوش تھی، لیکن بوجوہ یہ وقت پر شایع نہ ہوسکی، ۱۹۹۵ء میں ہاشمی صاحب مرحوم کے صد سالہ یوم ولادت کا اہتمام کیا گیا تو ان کے سعادت مند صاحبزادے ڈاکٹر ظہیر الدین ہاشمی نے اس مفید کتاب کے طبع و اشاعت کا فرض ادا کیا، میر محبوب علی خاں کا دور حکومت سلطنت آصفیہ حیدرآباد کا نہایت زریں و روشن باب ہے ان کی اور ان کے عہد کی مبسوط تاریخ کی ضرورت تھی، ہاشمی صاحب مرحوم نے اسی ضرورت کے پیش نظر اس کتاب میں میر محبوب علی خاں کی شخصیت، اوصاف و کمالات اور ان کے عہد کے اہم واقعات کا بڑا دلکش و موثر مرقع پیش کیا، موجودہ دور میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مثالی حکومت خصوصاً ان کی مذہبی رواداری کی ایسی داستانوں کی اہمیت اور سوا ہوگئی ہے، اس نادر کتاب کی اشاعت کے لئے اس کے ناشر شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

پریم چند : متفرقات متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد صفحات ۲۱۲، قیمت ۷۵ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵..۱۱۰۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ کی مطبوعات میں زیر نظر کتاب عرصہ ہوا موصول ہوئی تھی، افسوس ہے کہ اس کا ذکر خاصی تاخیر سے ہوا، کتب خانہ خدا بخش کے اشاعتی منصوبے میں اردو کے پرانے اور اہم رسائل سے مفید و منتخب مضامین کے مجموعوں کی

اشاعت بھی شامل ہے، پیغام، ہندوستانی، العصر، ادیب، صبح امید اور معیار وغیرہ رسائل کا انتخاب شایع بھی ہو چکا ہے، منشی دیانرائن نگم کے رسالہ زمانہ کانپور کا مجموعہ مضامین بھی اسی سلسلے میں شامل ہے، منشی پریم چند کی تحریروں کے متعلق یہ احساس رہا کہ ان کے ابتدائی نقوش صرف رسالہ زمانہ میں ہی تلاش کیے جا سکتے ہیں، چنانچہ ان کی تحریروں کی چار جلدیں جدا شایع کی گئیں، زیر نظر کتاب چوتھی جلد ہے اس میں پریم چند کی کہانیوں اور افسانوں سے الگ ہندو تہذیب اور رفاہ عام، قدیم ہندو علم و ریاضی، رانا پرتاب، سوامی وویکانند، جون آف آرک اور ٹالسٹائی وغیرہ موضوعات پر دلچسپ تحریریں ہیں، خاص طور پر دور قدیم و جدید اور قحط الرجال بار بار پڑھنے کے لائق ہیں۔

جنات کا بیان از جناب ڈاکٹر حافظ ہارون رشید صدیقی، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۴۴، قیمت ۲۴ روپے، پتہ: مکتبہ ندویہ پوسٹ بکس نمبر ۹۳، ندوہ، لکھنؤ۔

جن و شیاطین کے متعلق معتقدات و خیالات میں عقل انسانی اکثر افراط و تفریط کا شکار رہتی ہے ایک جانب ان کے وجود کا انکار کیا جاتا ہے تو دوسری طرف توہمات اور ضعیف الاعتقادی کی مثالیں بھی کثرت سے ہیں، فاضل مصنف نے اس باب میں صحیح اسلامی نقطہ نظر واضح کرنے کی غرض سے یہ رسالہ مرتب کیا اور جنوں کے وجود، ان کی خلقت، اقسام، ان کے کفر و ایمان، غذا، قیام گاہیں، اولاد اور ان کی قوت و نفوذ، عمل کے متعلق سلیس زبان میں معلومات فراہم کر دیے، ہمزاد، سحر، آسیب وغیرہ کے متعلق بھی صحیح عقیدہ اسلامی کی وضاحت کر دی، مسلمانوں کے ایک طبقے میں ادھر توہم اور ضعیف الاعتقادی کا مرض بڑھتا جاتا ہے توقع ہے کہ یہ کتاب اس بیماری کو دور کرنے میں معاون و مفید ثابت ہوگی۔

ع۔ص۔